فردوسِ وطن

کشن سمیل پوری

ڈوگری ساہتیہ مندر جموں

جنوری ۱۹۶۱ء

ناشر :- ڈوگری ساہتیہ مندر جموں

پرنٹر :- شری چندر پرکاش شوری - ویر ملاپ پریس جالندھر

باراوّل تعداد ۱۰۰۰

سرورق :- برج آرٹ سٹوڈیو جالندھر

کاتب :- گوسائیں پرشوتم لال شرما - جالندھر

قیمت :- تین روپے

انتساب

آنریبل خواجہ غلام محمد صادق

کے نام

کِشن سمیل پوری

"فردوسِ خیال"

"فردوسِ وطن" کے بعد ڈوگری ساہتیہ مندر جموں نے کشن سمیل پوری کا مجموعۂ غزل۔ "فردوسِ خیال" چھاپنے کی تیاری شروع کر دی ہے۔ جو بہت جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ اردو غزل سے دلچسپی رکھنے والے احباب انتظار فرمائیں۔

مینیجر ڈوگری ساہتیہ مندر جموں



The Author

فہرسِ عنوانات

نمبر صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۲	جموں	۹
۱۶	دریائے توی	۱۰
۱۹	مانسر	۱۱
۲۱	چناب کے ساحل کی ایک شام	۱۲
۲۴	بھوت کی ایک شام	۱۳
۲۷	خلد زار بھدرواہ	۱۴
۳۰	کشتواڑ کی ایک رات	۱۵
۳۲	سمیل پور	۱۶
۳۴	خلد آشیانی مہاراجہ گلاب سنگھ	۱۷
۳۸	خلد آشیانی مہاراجہ رنبیر سنگھ	۱۸
۴۰	یوگی راج مہاراجہ سرپرتاپ سنگھ	۱۹
۴۴	مہاراجہ ہری سنگھ کا نعرۂ حق	۲۰
۴۷	شہید ملت برگیڈیئر راجندر سنگھ ..	۲۱
۴۹	فاتح گلگت جرنیل ہشیارا کا پیغام	۲۲
۵۲	فاتح لداخ وزیر زورآور سنگھ	۲۳
۵۶	فاتح چترال جرنیل باج سنگھ	۲۴
۵۹	ماتر بھومی سے	۲۵
۶۳	فردوس وطن	۲۶
۶۵	نغمۂ کشمیر	۲۷

اغلاط نامہ

صحیح لفظ	غلط لفظ	سطر	نمبر صفحہ
افزائی	فزائی	۵	۸
ردائے	ادائے	۱۱	۲۴
پرتاپ سیں	پرتاپ سین	۷	۲۶
ہری سیں	ہری سین	۸	۲۶
طاقت سے	طاقت ہے	۱۴	۴۹
شرُ	شر	۱۵	۸۰

تعارف

[از جناب دیا کرشن گردش]

کنٹیلی جھاڑیاں ۔ بے ڈول پتھر ۔ اور جاں باز سپاہی ۔

صدیوں یہی تین چیزیں سرزمین جموں کے دامن کی زینت رہیں ۔ وہ جھاڑیاں جن کی پُرہول سرسراہٹ کے آنچل ہیں ۔ آتشیں اژدہوں کی پھنکاریں خوابیدہ ہوں وہ پتھر — جن کے پہلو میں چاند تاروں کے دل دھڑکتے ہوں ۔ وہ سپاہی جن کے بھالوں کی نوک پر موت ناچتی ہو ۔ اور جن کی ہیبت سے پہاڑوں کے جگر کانپتے ہوں اسی "سنگستان" کے دامن میں — ۲۷ ستمبر ۱۹۰۱ء کی چہچہاتی صبح کو پہلی نقرئی کرنوں کے ساتھ ۔ ایک ایسا غنچہ بھی پھوٹا ۔ جس کے سینے میں ۔ کچھ انوکھے ہی سپنوں کی سُندر گھاٹیاں ہُمک رہی تھیں ۔ کسے خبر تھی کہ یہ غنچہ جب کھلے گا ۔ پھول بنے گا تو اُس کی مہک کے جادو سے ۔ اس سنگلاخ دھرتی کے ذرّے ذرّے کو ۔ ایک لاہوتی انداز کی گویائی نصیب ہوگی ۔ اور ماضی کی گونگی داستانیں ۔ مدھ بھرے گیتوں میں تبدیل ہو کر ۔ کھوکھلی فضاؤں کے سینے میں چھلکنے لگیں گی ۔ کشن سمیل پوری ہے سرزمین جموں کے اس اوّلین اردو شاعر کا نام ۔ جس نے خاموش پگڈنڈیوں ۔ بوڑھے پیڑوں ۔ توی کی الہڑ لہروں ۔ قدیم چٹانوں ۔ پوپلے کھنڈروں ۔ آسمان میں

مُعلّق ٹھنڈے چاند۔ بوجھل راتوں، شگفتہ صُبحوں اور شوخ و شنگ دوپہروں کی سرگوشیاں سُنیں اور اُنہیں زبانِ شعر میں پیش کیا۔ وُہ سرزمینِ جمُوںؔ کا جارج میریڈیتھ ہے۔ جس کے یہ الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہیں گے۔

They have no song, the sedges dry,
And still they sing.
It is within my breast they Sing,
As I pass by.
Within my breast they touch a string.
They wake a sigh.

بسے، بدقسمتی تصوّر کیجئے یا اتفاق محض۔ کہ جمُوںؔ کی سنگلاخ دھرتی۔ اور اُس کا کہر آلودؔ ماحول کشن سمیل پُوری کے شاہینِ فکر کی اُڑانوں کے لئے زیادہ سازگار ثابت نہ ہُوا۔ اور وُہ عوام کی اُمنگوں اور رُوحوں میں سموکر بھی عرشِ شہرت کی اُس بلندی تک پہنچ نہ سکا۔ جہاں کشمیر سے باہر بسا اوقات مجھے وہ طائرانِ فکر بھی مصروفِ پرواز دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے بیشتر فرسودہ ترین تصوّرات۔ اور گھِسے پِٹے میکانکی عناصر کے پلندے سے کچھ بھی مختلف نہ ہوں ــ قُدما نے روایات کا جو دائرہ قائم کیا۔ بس اُسی چکّر میں۔ اُسی پُرانے ڈھب سے۔ قدیم اسالیب کی "گراں بار زنجیروں" کی جھنکار۔ اور ہجر و وصال کی روایتی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ عصرِ نو کی اُردو شاعری کا رہٹ چل رہا ہے ــ ایک طویل" اور لا مُنتہی راستہ۔ ہر گردش کے بعد پھر وہی مقام۔ اور قدموں تلے وُہی بار بار رَوندی کُچلی زمین۔ مجید لاہوری کی ایک نظم "کوُ آں". کے یہ الفاظ اِس منظر پر خوب صادق آتے ہیں ؎

کنواں چل رہا ہے مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں۔ نہ فصلیں۔ نہ خرمن۔ نہ دانہ
نہ شاخوں کی باہیں۔ نہ پھولوں کے مکھڑے۔ نہ کلیوں کے ملتھے، نہ رُت کی جوانی
ذرا۔ اُردو کی شاعری کے خد و خال تو دیکھئے۔

وُہی تر دامنی اور وُہی وضو۔ وہی پیرِ مُغاں اور وہی مے کدہ۔ وُہی یُوسفِ دِل اور چاہِ ذقن۔ وہی زلفِ گرہ گیر اور اسیرانِ بلا۔ وہی چاک جگر۔ اور وُہی تدبیر رفو۔ کسی نامسعُود ساعت میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا۔ کہ عشق کے روگ نے اُن کی تمام تر تاب و توانائی سلب کر لی ہے —

ؔ عشق نے غالبؔ نِکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بس یہی خیال ایک سانحہ بن گیا۔ اور اسی میں اُردو شاعری کا مستقبل ڈھلنے لگا۔ دردِ فراق اور نقاہت۔ مسیحا کی بے چارگی۔ پتھرائی ہُوئی آنکھیں۔ کھلا ہُوا مُنہ۔ مکھیوں کی بھن بھناہٹ۔ سانسِ مرگ اور پھر ایک بے گور و کفن لاش — مادی اور ذہنی ماحول میں کالے کوسوں کا فاصلہ۔ چائے کی ایک پیالی کے لئے کسی اَپ ٹو ڈیٹ کیفے یا رستوران کا رُخ —

"بوائے"

"کیا لاؤں حضور" ؟

"روسٹ چکن ! کافی۔ آئس کریم" —

مگر شعر گوئی پہ مائل ہوں تو وہی صحرائے نجد۔ اور وُہی مجنوں کا چہلم — کیا مجال جو مقصدی رنگ کی آلائش تک پیدا ہونے دیں۔ ظرفِ ماحول تو گویا اُنہیں جچتا ہی نہیں۔ یُوں کہئے کہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

گوئیٹے کو جب کالی داس کا ناٹک "شکنتلا" دیکھنا نصیب ہوا تو اُس نے لکھا :-

Wouldst thou the young year's blossoms
and the fruits of its decline
And all by which the soul is charmed,
enraptured, feasted, fed,
Wouldst thou the earth and heavens itself
in one sole name combine?
I name thee, O Shakuntla, and all at once is said.

کالی داس - ہورَسا اور ہَینجسٹ کا ہم عصر تھا - آخر اُس کے اِس شاہکار میں وُہ کون سی خُوبی تھی ؟ - جس نے گوئیٹے ایسے نقّاد کو اِن لافانی اور لطیف ترین الفاظ کی ادائیگی پر مائل کیا ؟ --- اِس کا جواب "ہندو تھئیٹر" کے مصنّف ڈبلیو - ایچ - وِلسن کے اِن الفاظ میں مِلے گا کہ :-

"کالی داس کا کلام اُس خوبصورت ندی کی مانند ہے - جس کے شفاف پانی میں وادی کے برف پوش پربتوں لبِ جُو پیڑوں - خود رَو پھُولوں - اور آسمان پر اُڑنے والی مُرغابیوں کی رنگین پرچھائیاں تھرک رہی ہوں اور اُنہوں نے سطحِ آب کو ایک حسین ترین تصویر میں تبدیل کر دیا ہو --"

اِن الفاظ کی روشنی میں یُوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حُسن و شباب کے برہنہ تصوّرات سے - جنسی بھُوک مِٹانے - یا روزِ ہجر اور شبِ وصال کے ڈانڈے باہم ملانے والی شاعری ایسے عناصر کی حامل نہیں ہوسکتی - جو زبان میں گھُلاوٹ -- نزہت اور صفائی پیدا کرنے کے علاوہ اُس کی رُوح پر مہرِ دوام ثبت کر سکتے ہوں

جنسی شاعری کی زبان تو کوک شاستر کی زبان ہی ہوگی۔ بلندی سے عاری اور شریفانہ احساسات سے یکسر تہی دست آخر وہ بھی کیا ادب ہے کہ اُس کی بدولت انسانی زندگی کا پوشیدنی شعبہ، جگنو کی دُم کی طرح ہر وقت چمکتا رہے۔ ذہن بارود کا زُود اشتعال انبار کہ پانچ سو گز کی دُوری ہی سے رنگین پیرہن کی ایک جھلک اُس کے لئے جہاں سوز چینگاری بن جائے۔ وہ وسوسے کے انداز میں بھٹ پڑے اور معاشرے کی "باچپ ٹی" پر اپنے گرم و سُرخ لاوے کی تیس (۳۰) فٹ موٹی تہ چڑھا دے۔ جنسی احساس زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے۔ لیکن زندگی محض جنس نہیں۔ زندگی کے دائرے میں دوسرے کئی عناصر بھی شامل ہیں۔ جن کے لئے اُردو شاعری کے قدیم و جدید رجحانات میں کوئی جگہ نہیں۔ پُرانی ڈگر پر ایک کارواں چلا جارہا ہے سبھی اصنافِ سخن اِس کارواں میں شریک۔ مہملیت۔ ابہام۔ عامیانہ طرزِ نگارش۔ اور بے تکے پن کی بوجھل گٹھڑیاں کندھوں پر۔ عُریانی یا فحاشی کی لٹھ ہاتھوں میں۔ اور شاید اسی لئے ہمارے ادب میں ایک ایسی حالت پیدا ہوگئی ہے کہ اخلاق۔ سرکش اور مُطلق العنان۔ روایات مضمحل و پریشان۔ زبان بے شوکت۔ تراکیب مُفلس! اسالیب بیمار۔ آدمیت غائب، اور جو ظاہر۔

جب تک شعر کا تعلق رُوح کے ساتھ تھا۔ بادہ و ساغر سے مشاہدۂ حق کی گُفتگو مقصود رہی۔ جب سے رُوح کا مقام جسم نے لے لیا۔ شاعر کی نگاہوں میں تمام کائنات سُکڑ سِمٹ کر۔ عورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ تخیّل کی فلاکت کا حسرتناک انجام نہیں تو کیا ہے؟ شاعر کا ذہن جب نئے ماحول کی تخلیق میں لُنجا ثابت ہوتا ہے۔ تو اُس کے لئے یہی ایک چارہ کار رہ جاتا ہے کہ وہ دوشیزاؤں کے جسمانی حدودِ اربعہ کے رومال سے سماج کے آنسو پونچھنے کی طرف مائل ہو۔ اُسے معلوم ہے کہ انسانی دل و دماغ میں حُسن کے لئے ایک قدرتی کشش

موجود ہے۔ وہ اِس علم کا فائدہ اُٹھا کر اخلاقی اثار کی پیدا کرنا چاہتا ہے تا کہ اُس کی دماغی مُفلسی بے نقاب نہ ہو۔ مگر عیب ، لاکھوں حسین ترین پردوں میں بھی عیب ہے۔

دو چیزوں کا باہمی موازنہ ہی ہمیشہ اچھے اور بُرے میں حدِ امتیاز قائم کرتا ہے۔ نپولین انگلستان کے سپاہی اور اُس کے ہتھیاروں کو تبھی بُرا کہہ سکتا تھا کہ اُس کے سامنے فرانس کے اچھے سپاہی اور عمدہ ہتھیاروں کی مِثال موجود ہو۔ میں اگر حالیہ اُردُو شاعری کو اچھا نہیں سمجھتا تو اِس لئے۔ کہ میرے نزدیک اچھی شاعری وُہ ہے جو مشق و مزاولت کی مرہُونِ منّت نہ ہو۔ جس میں تازگی۔ تنوع۔ اور پیغام۔ یہ تینوں چیزیں موجود ہوں۔ جو ذہنی بے مائیگی کا "عکسِ لطیف" نہ ہو۔ جو توازن اور بصیرت سے محروم نہ ہو۔ یہ نہیں کہ وہ ملک میں معصیّت کوشی اور عشرت پرستی کو فروغ دے اور انجام کار اُسے کوئی غیر ملکی طاقت اپنے گھوڑوں کے سُموں تلے روند ڈالے۔ ایرانِ قدیم کی تاریخ اِس تعلق میں سُرمۂ بصیرت کا حکم رکھتی ہے۔ رُڈیارڈ کپلنگ کے یہ الفاظ کیا خوب ہیں کہ

Cities and thrones and powers.
stand in time's eye.
Almost as long as flowers.
which daily die.

یعنی جس طرح پھُول کھِلتے اور مُرجھا کر خاک میں مِل جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی حالت بڑے بڑے شہروں۔ بادشاہوں اور طاقتوں کی ہے۔ وقت کی نگاہوں میں اُن کی کوئی حقیقت یا قدر و منزلت نہیں۔ شائد اِسی لئے کِشن سمیل پوری کا ذہن اُن لافانی عناصر کا نغمہ خواں ہے جنہیں وقت کے بوجھل رتھ کے پہیّے روند

نہیں سکتے ۔ اِن میں سے ایک ہے اُس کا وطنِ عزیز۔ جس کی مٹی سے وُہ اُبھرا۔ یہ مٹی اُس کی نگاہوں میں کہکشاں سے کم اُجلی نہیں۔ جس کی ہواؤں کا دامن وُہ اپنے گیتوں سے بھرتا رہا۔ اور جس کے سیم گوں جھرنوں ۔ دریاؤں اور چشموں کی گنگناہٹوں پہ اُسے فرشتوں کے نغموں، کا گماں، ہوا۔ اِسی وطنِ عزیز نے اُسے خوبصورت اور نکھرے ہوئے الفاظ دیئے۔ متبسّم تراکیب ۔ شاداب محاورے اور چھلکتی ہوئی اصطلاحیں مہیا کیں ۔ وُہ نیلی نیلی خنک جھیلیں ۔ وُہ آبشار ۔ وہ دلفریب گھاٹیاں وُہ گھنے بن۔ وہ جمیں مرغزار ۔ وہ پہاڑوں کی دلپذیر قطاریں۔ اور اُن کے سروں پہ برف کے اُجلے عمّامے ۔ فردوسِ کشمیر کے لازوال حُسن نے کبِش سمبل پوری کے نغموں پر بھی مُہر دوام ثبت کردی ــــ اُس نے کئی ایک بہادروں اور جانبازوں کی مدح میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ اور یہ شاید اِس لئے۔ کہ مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ میں

"ــــ صاف اور عمدہ اور پاکیزہ جذبات کو قوم میں پھیلانا ہو۔ تو اُس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اُن کی محسوس اور زندہ مثالیں پیش کی جائیں ۔ فرانس کے شجاعانہ جذبات کو صرف ایک نیپولین کا نام جس قدر اُبھار سکتا ہے ۔ بڑے بڑے اخلاقی لیکچر وہ کام نہیں دے سکتے ۔ یورپ میں سینکڑوں ہزاروں اشخاص نام و نمود کے منبر پہ نمایاں ہوتے ہیں ۔ اور صرف یہ بات اُن کے ارادوں اور حوصلوں کو روز بڑھاتی اور تیز کرتی ہے کہ جو کچھ وُہ کرتے ہیں ۔ تمام عالم میں اُس کی آواز پھیل جاتی ہے ۔ قوموں کا بننا اُبھرنا ۔ اور اُن کے جذبات کا تازہ اور مشتعل ہوتے رہنا اِس بات پہ موقوف ہے کہ اُن کے اوصاف کی صحیح داد دی جائے ۔ اُن کے کارنامے نمایاں اور اُجاگر کئے جائیں ۔ اُن کا ہر کام تاریخی صفحات

پر چمکایا جائے —

شاعری کے محرکات میں "ذہنی نشاط" بھی شامل ہے۔ اور زندگی کی کچھ ازلی قدریں بھی، جن کا مقام مشاہدات و موجودات کی حدوں سے بہت بلند ہے۔ یعنی رُوحِ دوام۔ اول الذکر محض ایپی کورس کے فلسفۂ لذتیت کی نقاہت ہے تو مؤخر الذکر ایک معراج جو ہر دور میں قطبی ستارے کی مانند زندگی کے تاریک اور طوفانی سمندر میں بھولی بھٹکی کشتیوں کی راہ دکھا رہی ہے۔ ہومر کے رزمیہ کو مذہب اور دیوتاؤں سے وابستگی ہونے کے سبب وہ بلندی نصیب ہوتی کہ آرنلڈ جے۔ ٹائین بی نے "سٹڈی آف ہسٹری" میں لکھا کہ "وہ شاعری جو مادی تہذیب کی پیداوار ہو کبھی بھی دور میں ہومر کے کلام کی سدا بہار شوکت۔ اور اس کی بے اختیار چھبن تک پہنچ نہیں سکے گی"۔

"ویدک انڈیا" کے مصنف زناٹیڈی۔ اے۔ رگیوزن نے "سدا بہار" کی یہی ترکیب رامائن۔ مہابھارت اور کالی داس کی تصانیف کے لئے استعمال کی ہے۔ اُس نے شاعری کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو پہاڑی دریا کی طرح اُچھلتی۔ اُبلتی اور جھاگ اُڑاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ یہ زوال اور انحطاط کا عمل ہے۔ دریا جتنی بلندی سے نیچے کی طرف جائے گا۔ اُس کے پانی کی رفتار اُتنی ہی تیز ہوگی۔ شاعری میں دریا کے پانی کا مقام الفاظ کی جادوگری لے لیتی ہے۔ کھنکتے۔ اُبھرتے اور ناچتے ہوئے الفاظ جن کا تعلق دو ہی چیزوں سے ہو سکتا ہے۔ پیٹ یا جنس۔ جدید شاعری میں آگ۔ ہتھوڑا۔ درانتی۔ نالی۔ کھنگن۔ مزدور۔ اور انقلاب۔ قدیم شاعری میں ساغر و بادہ اور گریۂ سحری یا آہِ نیم شبی۔ گویا ؎

گفتم کہ مگر قاضی و مفتی سمراند۔

در راہِ طریقت و حقیقت بلد اند ۔

چوں برہبرِ راہ آمدم دانستم
کیں ہم سفراں ہمہ چوں من نابلد اند

اس کے برعکس دوامی زمرے کی شاعری سمندر کی اس لہر کی طرح اٹھتی ہے جو ماہِ کامل کو چھوتا چاہتی ہو - ایک کا رخ پستی کی جانب ہے تو دوسری کا بلندی کی طرف - گویا ایک شاعری سماج کی بے ترتیبی - ذہنی لوکھلاہٹ - اور انتشار کا مآل اور ژولیدگی آمیز دور کی تصویر ہے تو دوسری کا مصوّرِ "طائرِ فردوس" کا صیّاد اور اُن بستیوں میں اس کا نشیمن؛ جن کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔

کشن سمیل پوری بھی خاکِ وطن کے ہر ذرّے میں تقدّس کی جھلک پیدا کرتا ہے اس سے ایک نئے دیوتا کا بت تراشتا ہے - وہ اپنے اس اپالو کے لئے ایک پرشکوہ مندر بناتا ہے - پھر اس کی حمد میں گیت لکھتا ہے - وہ شاید میتھیو ارنلڈ کے اس نظریہ پہ کاربند ہے کہ "شاعری میں وہی تقدّس آفریں عناصر پیدا کئے جانے چاہئیں جو مذہب اور صرف مذہب کا طرۂ امتیاز ہیں" اسی عقیدتمندانہ عمل کی بدولت - کشن کی شاعری زمین سے اٹھ کر کہکشاں سے بغل گیر ہو جاتی ہے اور ابھی یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اس مسافر کی حقیقی منزل کہاں ہے - شاید کشن سمیل پوری کی حالت بھی ڈینیل سے کچھ مختلف نہیں جس نے کہا تھا کہ

And who in time knows
whither we may vent.
The treasure of our tongue?
To what strange shores
This gain of our best
glory shall be sent.

کرشن کے ذوقِ سلیم کا حقیقی معبود ہے یہ عظیم ہندوستان — جس کی قدیم شاعری بھی طباعی۔ مضمون بندی۔ اشاروں اور تراکیب کے ناپ تول۔ گوناگوں اصطلاحوں اور تلمیحات۔ سوز و ساز اور ترنگ۔ رنگینی اور حلاوت۔ تخیّل کی شوکت اور الفاظ کی کثرت کے اعتبار سے اِس عظیم ملک کی نا پیمودہ وسعتوں۔ دلکش مناظر اور اُس کے فطری تنوع کے مقابلے میں کچھ کم بیکراں نہیں۔ دو عظیم رزمیے۔ مہا بھارت اور رامائن' اوّل الذکر ایک لاکھ دس ہزار شلوکوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کا ہر مصرعہ کسی بھی عام بحر کی انگریزی نظم کے مصرعے سے دوگنا لمبا — یہ دونو شاہکار بجا طور پر ہندوستان کی شجاعت۔ تاریخ۔ روایات۔ مجلسی زندگی۔ سیاست۔ فلسفہ مذہب — اور اخلاقیات کا "اِن سائیکلو پیڈیا" ہیں۔ ایک ایسا نادر خزینہ جو گوناگوں گہرپاروں سے بھرپور ہو۔ ہر لفظ۔ ہر جملہ۔ ہر مصرعہ اور ہر شلوک انسانی ذہن کو ایک انوکھی ہی دنیا میں اُڑا لے جاتا ہے۔ نگاہوں کے سامنے ہر موڑ پر ایک نیا۔ سرسبز اور شاداب ترین ماحول پیش کرتا ہے۔ کہیں اُدنگھتی ندیاں۔ کہیں گنگناتے آبشار۔ کہیں تا حدِ نظر پھول ہی پھول۔ کہیں گھنے بن۔ اِن بنوں میں رشیوں کے آشرم اور اُن کا روحانی ماحول — کہیں میدانِ جنگ کے پُرہول مناظر۔ کہیں شہروں کی ریل پیل۔ گھریلو زندگی کی پُرکیف جھلکیاں۔ شاہی دربار۔ منڈیاں اور بازار۔ کہیں کھیت۔ کہیں گھاٹ۔

قدیم ہندوستان کی شاعری صرف مہا بھارت اور رامائن ہی پر مشتمل نہیں۔ ہندوستان کا ماضی ہی در حقیقت ایک طویل نظم ہے۔ ہزاروں میل لمبی نظم۔ ہندوستان کا قدیم اتہاس۔ اُس کی سمرتیاں یعنی قوانین۔ حساب۔ جیومیٹری۔ فلکیات۔ حکمت۔ جراحت۔ فلسفہ۔ نحو۔ پندو مواعظت۔ سائنس۔ گھریلو اور مجلسی زندگی کے قواعد۔ ڈرامہ۔ پرندوں اور چوپائیوں کی کہانیاں۔ چھ "درشن" اور اٹھارہ پُران۔ اِن کے علاوہ یہ سبھی کچھ زبانِ شعر ہی میں تو ہے۔ سب سے بڑا پُران اکیاسی ہزار۔ اور سب سے چھوٹا دس ہزار۔

اشعار پر مشتمل — ان میں سے کئی ایک کتابیں یورپ کی بیشتر زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں
زیناٹیڈی رگوزن نے لکھا ہے کہ ۔ دنیا کی کوئی بھی قدیم و جدید قوم شعر کے میدان میں ...
کی بلندی کو پہنچ نہیں سکی ۔ نامعلوم اتنے شاندار پس منظر کی موجودگی میں بھی اردو شاعری آج
تک کیوں ہندوستانی مزاج کی ترجمان اور عوامی امنگوں کی آئینہ دار نہیں بنی۔ دوسری طرف
اہل یورپ ہیں کہ ہندوستان کی اس دولت سے اپنے ادبی خزانہ کی چمک دمک بڑھانے
میں مصروف ہیں ۔ حتیٰ کہ مشہور روسی شاعر پشکن کے کلام میں بھی رگ وید کی مناجات
کی جھلکیاں موجود ہیں ۔ بالخصوص "پرجنیہ" یعنی ابر بہار سے متعلق (لڈ وگ)

ہماری یہ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے ۔ پچھلی تین صدیوں میں صرف طرز شہریاری
اور طریق مے گساری ہی نہیں ۔ زندگی کی دوسری شاخوں میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی
ہے ۔ جدید دریافتوں ۔ اور نئے اسلوب ماند و بود کے سبب اب محمود و ایاز ۔ شمع و
پروانہ ۔ تیشہ و کوہکن ۔ یا پائے مجنوں اور صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ میں کوئی
کشش ہی باقی ہے نہ حقیقت ؛ جوئندہ و یابندہ دونوں نئے اور پرانی قدروں
سے ناآشنا ۔ اس نئے ماحول میں ہندوستان ہی کیا دنیا بھر میں شاعری کی حیثیت
چراغ سحری سے کچھ بھی مختلف نہیں ۔ ہیرلڈ منرو نے "بیسویں صدی کی شاعری" کے
تعارف نامہ میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ عصر حاضر نے شاعرانہ مزاج سے اگر کچھ پیدا کئے ہیں
شاعر نہیں ۔

بین الاقوامی شہرت کے نقاد ۔ الف ۔ آر ۔ لیوس کا نظریہ تو یہ ہے کہ ماڈرن
منظومات کی حیثیت ان بچوں سے مختلف نہیں جو ماں کے پیٹ سے مردہ پیدا ہوئے
ہوں ۔ ہمیں سفید سفید اوراق پر منظوم انداز کے جو کالے کالے الفاظ ایک خاص سلیقے سے
بکھرے اور پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کی جڑیں نہیں ۔ کھوکھلے ۔ غیر مربوط ۔
بے ہنگم اور بناوٹی سے الفاظ جو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ نیا دور شاعری کے لئے ناساز گار

ہے۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ اس دور کی شاعری دُنیا کے کسی بھی گوشے میں اپنے لئے کوئی گہری کشش پیدا نہیں کر سکی۔ انحطاط کا یہ دَور آج سے ایک سو برس قبل شروع ہوا تھا ہندوستان ہی کو لیجئے۔ اس نے پچھلی ایک صدی میں صرف حالیؔ۔ اکبرؔ الہ آبادی اور اقبالؔ ہی تین ایسے شاعر پیدا کئے ہیں جنہوں نے اجتہاد کی راہ اختیار کی۔ مجھے جناب رشید احمد صدیقی کے یہ الفاظ بہت برمحل دکھائی دیتے ہیں کہ ——

"اردو شاعری میں خرافات کا احساس سب سے پہلے حالیؔ نے کیا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو بازی گروں۔ بے فکروں۔ بزدلوں یا بیماروں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ شرفا اور صُلحا کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اُن کے اخلاق و اجتہاد نے اُردو شاعری کی لاج رکھ لی۔ حالیؔ معنوی اعتبار سے اقبالؔ میں نمایاں ہے۔"

انگریزی شاعری میں کالرج۔ ورڈز ورتھ۔ بائیرنؔ۔ شیلےؔ اور کیٹسؔ —— اور اسی دور کی اُردو شاعری میں مرزا غالبؔ اور اُن کے ہم عصر شعرائے جو دائرے معیّن کئے تھے وہ آج بھی قائم ہیں۔ حالانکہ کالرج اور غالبؔ کے زمانہ سے دُنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ اب پُرانے وقتوں کے وہ نواب ہی باقی ہیں۔ نہ اُن کی روائتی وضع داریاں۔ ۱۷۹۶ء کے بعد دنیا کے سیاسی۔ سائنسی اور معاشرتی خدوخال کچھ اس تیزی سے تبدیل ہوئے۔ کہ رونلڈ بوٹرل یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ :——

Nightingales, Anangke, a sunset or the meanest flower,
Were formerly the potentialities of poetry,
But now what have they to do with one another,
With Dionysus or with me?

اگلے بند میں رونلڈ بوٹرل لکھتا ہے۔ اگر شاعری کی نئی بُنیاد حشرات و نباتات

کے خورد بینی تجزیہ - بجلی گھروں کے کھمبوں - ٹرانسفارمروں - گرڈری ڈھانچوں اور اسی نوع کی دوسری چیزوں پہ اُستوار نہ ہُوئی تو مستقبل قریب میں اس کی حالت عجائب خانہ کے اثاثہ سے کچھ بھی مختلف نہ ہوگی - لیکن رونلڈ کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ چند برسوں میں اٹمی قوت کی بدولت "برقی معاشرہ" بھی قصّۂ پارینہ ہو کر رہ جائے گا - طُرفہ یہ کہ - "اب ہماری اس دُنیا کی ہر شے کچھ اس رفتار سے گھومنے اور دوڑنے لگی ہے - کہ اربابِ ذوق و نظر کو اتنی بھی فرصت مُیسّر نہیں کہ ثانیہ بھر ٹھہر کر یہ سوچ سکیں کہ رگِ گُل سے بُلبُل کے پر باندھنے میں کتنی چابکدستی روا رکھی گئی ہے - یا زُلفِ گرہ گیر کے بیان میں شاعر کا ذہن کس طرح اُلجھ اُلجھ کر رہ گیا ہے - ہمارے سامنے چین کی مثال موجود ہے - جہاں بُلبُل اور اُس کے بھائی بند عنادل کو اس لئے ابدی نیند سُلا دیا گیا کہ وُہ انسانی غذا میں حصّہ دار نہ بنیں اور زُلفِ گرہ گیر کو اس لئے مقراض کی نذر ہونا پڑا کہ وُہ بورژوائی نظام کی آخری یادگار تھی - مُدعا یہ کہ زندگی کی قدریں بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں - اور اگر اس دَور میں اُردو شاعری کو زندہ رہنا ہے تو اُسے زندگی کی مُستقل اور ازلی قدروں کو اپنا مُستقر بنانا ہوگا - اقبال مرحوم نے بھی ابتدائی دَور میں اسی نظریہ سے حُبّ الوطنی کو اپنے تصوّرات کا نشیمن بنایا - ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اِس کی وُہ آشیاں ہمارا

اُسی دورِ سعید کی یادگار ہے - لیکن بعد میں پاؤں پھسل گیا - دُوسرے دَور میں اقبال نے جن ذہنی رجحانات کو تاب دینے کی کوشش کی اُن کی مُنہ بولتی تصویر ہے یہ شعر ؎

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صُورتِ ماہی

لیکن ۱۹۴۷ء کا انقلاب ایک کدال ثابت ہوا۔ جس نے اقبال کی شاعری کے دوسرے دور کی تمام تر عمارتوں کو زمین بوس کر دیا۔ وہ اپنے ہمنواؤں کو صورت ہائی "آزاد وطن" ــــ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن انہوں نے قیدِ مقامی کو پسند کیا۔ اور اپنے لئے ایک الگ گھروندہ بنالیا۔

ہیزک ابسن کے "ماسٹر بلڈر" میں "ہال ورڈ سول نس" اپنے زمانہ کا معمارِ اعظم تھا۔ وہ اپنی زندگی میں گرجا گھروں کے اونچے اونچے مینار تعمیر کرتا ہے لیکن ان میناروں کی بلندی کے تصور ہی سے اس کا سر چکرانے لگتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک بار ایک مینار پر چڑھ کر کہتا ہے۔

"اے ربّ العالمین اب میں تیرے لئے گرجا گھر اور مینار نہیں بناؤں گا میں چھوٹے چھوٹے انسانی گھر تعمیر کروں گا۔ جہاں نوجوان انسانی روحیں پیار، اطمینان اور مسرت کی زندگی بسر کر سکیں"

جن لوگوں نے فرائیڈ کے نظریوں کا سطحی سا جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ باآسانی بتا سکیں گے کہ معمارِ اعظم "ہال ورڈ سول نس" کا وجود ایک گہری طنز ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مکان بنانے کا قصہ صرف اسی لئے کرتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔ نوجوان روحوں کی مسرت محض ایک حیلہ ہے۔ ڈاکٹ بوس میناروں کی بلندی کا خیال آتے ہی اسے سرگرانی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں انجام کار ہلڈا رونما ہوتی ہے جس نے سول نس کی روح کو جھنجوڑا۔ اسے یقین دلایا کہ تو بیمار نہیں۔ سول نس نے محض ہلڈا کو خوش کرنے کے لئے ایک نئے مینار کی چوٹی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ پہنچ بھی گیا۔ لیکن ہلڈا زمین پر تھی۔ اور سول نس عرش و فرش کے درمیان معلق تھا ــــ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ نیچے گر گیا۔ اور جسم پاش پاش ہوگیا۔ گویا ناپائیدار اور فانی قدریں کسی شخص کو "ہال ورڈ سول نس" کی طرح زمین

سے اُٹھا کر شہرت کے بلند ترین مینار پر بٹھا دیں تو بھی وہ بلندی اُس کا مستقل نشیمن ثابت نہ ہوگی۔ اور وہ جلد یا بدیر ماسٹر بلڈر کی مانند زمین پر گر کر چُور چُور ہو جائے گا۔

اُردو شاعری میں ہر حال ورڈسورتھ کی دُنیا میں ایک حقیقی یا قیاسی ہلڈا طلوع ہوتی ہے۔ اُس کی تحریک پر وہ عرشِ شہرت کی طرف لپکتا بھی ہے۔ لیکن اُس کا دل تو خاک نشیں ہلڈا کے جمال کی کھونٹی سے بندھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا تھا۔ ؎

جہاں میں لذّتِ پرواز حق نہیں اُس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اتل چندر رائے کے خیال میں ہندوستان کے زوال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایسا کوئی شاعر قرونِ وسطیٰ میں پیدا نہ ہوا جو حُب الوطنی کی آگ دلوں میں روشن کرتا اور اُن شخصی کدورتوں اور انفرادی رقابتوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کرتا۔ جو غیر ملکی حملہ آوروں کو فتحیاب بنانے کا سبب بنیں۔ صد حیف کہ قرونِ وسطیٰ میں ایک بھی عمرو بن کلثوم ہندوستان کی مٹی سے نہ اُٹھا۔ جس کے متعلق مولانا شبلی مرحوم کا ارشاد یہ ہے کہ :- اُس نے ایک قصیدہ لکھا اور عکاظ کے میلہ میں پڑھا۔ دو سو برس تک اِس قصیدہ نے قبیلۂ تغلب میں شجاعت کا جوش قائم رکھا۔

مغرب میں ٹینی سن۔ جولیا وارڈ ہوو۔ والٹ وائیٹ مین۔ جولین گرین فیں۔ تھامس ہارڈی۔ روپرٹ بروک، سوائین برن۔ لارنس بائنن۔ کلف اور دوسرے سینکڑوں شعراء نے حُبّ الوطنی کی مشعل روشن رکھنے میں نمایاں حصّہ لیا اور اسے بجھنے نہ دیا۔ اُنہوں نے اپنے وطنِ عزیز کے مناظر۔ سر بکف سپاہیوں۔ شہیدوں۔ جرنیلوں اور بڑھتی ہوئی فوجوں کو اپنے گیتوں اور نغموں کا موضوع بنایا۔ امریکہ میں ہینری ڈائیک۔ سٹر کھترس برٹ۔ ایما لونڈ ارس۔ وائیٹ مین۔ سبنڈ برگ۔ لائیبر مین۔ راڈمین۔ پوڈریک۔ ویڈز ورکھ۔ مرتھا کیلر۔ جیمز اوپن ہیم اور دوسرے کئی لوگ پیش پیش نظر آتے

ہیں۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں پنڈت برج نرائن چکبست نے خیالی معشوقوں اور دقیانوسی تصوّرات کا طِلسم توڑا۔ وُہ معصیّت کی شاعری کے بطلیموسی نظام میں گلیلیو بن کر نمودار ہُوئے۔ اُنہوں نے خود اقرار کیا ہے کہ ؎

نیا مسلک، نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبستؔ کی حُبّ الوطنی کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے اپنی نظم کے مجموعہ کا نام بھی "صُبحِ وطن" رکھا۔ چکبست کے بعد تحریکِ آزادی کے دَور میں مولانا ظفر علی خاں۔ پنڈت میلارام وفاؔ۔ اور جوشؔ ملیح آبادی نے وطن پرستی کے جذبہ کو اُبھارا اور کئی ایک ایسے دوامی شاہکار تخلیق کئے جو ایک پُرآشوب دَور میں قوم کے ہاتھ میں تلوار ثابت ہُوئے۔ لیکن پیش پا اُفتادہ خیالات اور الفاظ کے گورکھ دھندوں کی آندھیاں بھی بدستور اُمڈتی رہیں۔ آزادی نصیب ہونے کے بعد تو آسمان ۔ گویا دھوآں دھار نظر آنے لگا۔ اِس تاریک ماحول میں ہندوستان کے شمالی گوشے میں ایک چمک پیدا ہُوئی۔ ایک تارا اُبھرا۔ "فردوسِ وطن" ہے اِس کا نام۔ نغمگی اور شعریّت کا خورشید پارہ۔ سچ پُوچھئے تو معنوی اعتبار سے مجھے "فردوسِ وطن" کا ڈانڈا "صبحِ وطن" سے ملتا دکھائی دیتا ہے۔

پنجاب کے ایک اہلِ نظر نے "فردوسِ وطن" کا نسخہ دیکھا۔ اور فرمایا۔ "یہ ایک مقامی حیثیّت کی چیز ہے۔ آخر جہلم۔ چناب۔ اُدجھ۔ نیرو اور توی کا ہندوستان کے دُوسرے حصّوں سے کیا تعلق"؟ لیکن کِشن سمیل پوری کی والہانہ عقیدت کا سبب یہ ہے کہ اُسے اِن دریاؤں میں وُہ شفاف پانی رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ جو برسات کی ہوائیں بحرِ ہند سے اُڑا لاتی ہیں۔ اور اِسے کشمیر کے جھیل کوہساروں کی چوٹیوں پر برف کی صورت جمع رکھتی ہیں۔ یہ پانی کشمیر کے پہاڑوں کی مٹی اپنے ساتھ لے کر ایک بار پھر بحرِ ہند میں جا ملتا ہے۔ کِشن سمیل پوری کو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اِس پانی میں

شمال اور جنوب باہم بغلگیر ہوں۔ ہندوستان کی وحدت کا ایک لافانی اور ابدی منظر ــــ اس جگہ مدراس یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر ڈاکٹر ٹی۔ ایم۔ پی۔ مہادیون کے ان الفاظ کا ذکر بے جا نہ رہے گا۔ کہ

"ـــ شمال میں کوہ ہمالیہ سے لے کر جنوب کے سمندروں تک پھیلا ہوا ہندوستان محض ایک جغرافیائی اکائی ہی نہیں۔ بلکہ ایک روحانی نظریئے اور پاک وجود کا مظہر بھی ہے۔ ہندوستان اگر اندرونی اختلافات اور بیرونی حملوں کے باوجود۔ قرن ہا قرن کسی چیز کو محفوظ رکھ سکا تو یہ اُس کی فلسفیانہ ثقافت ہے جو اُس کا عظیم ترکہ ہے۔ یہ ترکہ صرف اس لئے محفوظ رہ سکا کہ اہلِ فکر و دانش جو ہمیشہ اس مُلک کے ہر حصہ میں موجود رہے، عوام میں سالمیت کا احساس پیدا کرتے رہے ـــ"

☆

شنکر آچاریہ آندھرا میں پیدا ہوئے اور کشمیر پہنچے۔ کالی داس نے وراٹ نگر (اکھنور) میں جنم لیا۔ اور جنوبی ہندوستان میں واصلِ حق ہوا۔ جس طرح جنوبی سمندروں کا پانی ہمالیہ کا رُخ کرتا ہے۔ اور ہمالیہ کی مٹی بحرِ ہند تک جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کا ثقافتی ترکہ بھی ہماری قومی وحدت کا ثبوت ہے۔ ہندوستان میں "مقامیت" کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ کشن سمیل پوری اسی اصول کا علم بردار ہے۔ "فردوسِ وطن" اسی نظریئے کا آئینہ دار ـــــ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ـــ

کہسار کی ہر چوٹی ـ برفانی و نُورانی
خورشید بھی خود آکر بھرتا ہے یہاں پانی

برفانی و نُورانی چوٹیوں پہ خورشید کا آکر پانی بھرنا ایک ایسی جگمگ اور اچھوتی اُپج ہے جو کشن سمیل پوری ہی کے ذہن میں آسکتی ہے۔ وہ ماضی کو حال میں سمو کر

اپنے وطنِ عزیز میں ایک نیا جمال پیدا کرتا ہے۔ ایک ایسا جمال جس میں مذہب کا تقدّس بھی شامل ہے۔

گوکل ہے اگر جموّں - جمنا ہے توی اِس میں
متھرا کے نظارے ہیں موجود سبھی اِس میں

کِشن کی چشمِ تصوّر جموّں کے عظیم الشان شہر کی گنجان آبادیوں کے پس پردہ وُہ کوہستاں دیکھتی ہے جہاں فکرِ روزگار میں ڈوبے ہوئے انسانوں کی بجائے ایک بھُولا بسرا ماضی گاتا اور مُسکراتا ہے۔ اُن پرندوں کے بھیس میں جو سرزمینِ جموّں کے جنگلوں اور پہاڑوں کی رُوحِ رواں ہیں۔

گیت فُرقت کے شبِ سیمیں میں گاتے تھے چکور
ناچتے تھے ہر طرف برسات کے موسم میں مور

کِشن کو وطنِ عزیز سے والہانہ محبّت ہے۔ پھر اُس کے لئے اُس چھوٹے سے گاؤں کو اپنی اِس محبت میں حصہ دار نہ بنانا کیسے ممکن تھا۔ جہاں اُس نے سُورج کی پہلی کِرن دیکھی۔ اپنے مقامِ پیدائش سمیل پور کے بارے میں وُہ لِکھتا ہے۔

ہر وقت شیخ کو ہے غمِ خُلد، شوقِ حُور
مطلُوب برہمن کو ہے چشمِ درُوں کا نُور
رندِ خراب حال ہے غرقِ مئے و سرُور
کوئی اِسے سمجھ لے مرے ذہن کا فتور
سَو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمیل پور

منظر کشی کِشن کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو اُسے اپنے کئی معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، کشمیر کے نشاط باغ کی وُہ ایسی حسین تصویر کھینچتا ہے کہ اِس گلشنِ سدا بہار کا منظر ہُو بہو آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتا ہے۔

گرمیوں کی دوپہر، باغِ نشاطِ کاشمیر
مُو بہ مُو فردوسِ پیکر۔ ہُو بہ ہُو جنّت نظیر
رُوح پرور حَوض، سبزہ، نہر، فوّارے چنار
غم رُبا۔ راحت فزا۔ مَے بار نغماتِ ہزار
ہر طرف اَشجار جاں پرور قطار اندر قطار
غُنچہ و گُل شاخ ساروں پر بہار اندر بہار

کشمیر کے مَرغ زاروں میں ایک نازک سی بیل کو سرْو کے ایک جواں سال پیڑ سے ہم آغوش دیکھ کر اُس کی ہستیٔ احساس انگڑائی لیتی ہے۔ اور وُہ سوچتا ہے۔ ہو نہ ہو۔ شہنشاہ جہاں گیر اور ملکہ نُورجہان بغل گیر ہو رہے ہیں۔ کشمیر میں اُسے جمال کے ساغر چھلکتے دکھائی دیتے ہیں اور وُہ مستانہ وار پکار اُٹھتا ہے۔

ے

عجب ہے یہ دُنیا۔ عجب سرزمیں ہے
ہر اک چیز اِس کی۔ جمیل و حسیں ہے
فلک نیلمی ہے۔ زمیں مخملیں ہے
سحر رُوح پرور، تو شب دل نشیں ہے

غربت میں کشن کو وطن کی یاد آتی ہے تو وُہ جذبۂ محبّت کے زیرِ اثر کچھ اِتنے مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ جیسے جمّوں باغِ جنّت کا کوئی گوشہ ہو۔ جہاں حسُن ہے موسیقی ہے۔ شعریّت ہے۔

ے

ہمیشہ ماہ پاروں سے مکاں جس کے درخشاں ہیں
مثالِ کہکشاں صاف اور روشن جس کی گلیاں ہیں

بہاریں باغ جس کے غیرتِ گلزارِ رضواں ہیں
حسیں۔ خوش لہجہ طائر جس کے ہر بن میں غزل خواں ہیں
جہاں ہر ہر قدم پر شعریت موتی لُٹاتی ہے
اُسی کی یاد رہ رہ کر مرے دل کو ستاتی ہے

کرشن سمیل پوری بلا شبہ ایک بلند فکر ادیب اور ایک سحر طراز شاعر ہے۔ اس کی طباعی کا مدار "اقلیدِ سیاب" پر نہیں۔ شاعری کے ساتھ اس کا رشتہ سر بسر تخلیقی اور فطری ہے۔ تقلیدی نہیں۔ تیز دُنند نشتر کی روانی۔ پہاڑی عقابوں کی بلند پروازی اور بگولوں کا خرام۔ شعلوں کی لپک۔ پھولوں کا تبسّم اور اُن کی رنگینی۔ قوس و قزح کی دلآویزی۔ طوفانوں کا جلال۔ زلزلوں کی بلا خیزی اور معصوم دیہاتی دوشیزاؤں کی سادگیٔ طبع۔ یہ تمام عناصر کسی نہ کسی رنگ میں کرشن سمیل پوری کی دماغی کاوشوں کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اس کے جوہرِ ذاتی کے مختلف پہلو۔ یہ وہ چیزیں نہیں۔ جن کی پرکھ کے لئے ناپ تول کے پیمانوں۔ ترازوؤں اور گزوں یا جریبوں کی احتیاج ہو۔ یہاں تو "نگاہ" چاہیئے ــــ وُہی نگاہ۔ جس کا اشارہ اقبالؔ کے اِن الفاظ میں ملتا ہے۔

ے

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگِ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت؟

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے حبؔ وینس میں لبِ دریا ایک عظیم سنگین ستون پر "اُڑن شیر" کا مجسمہ دیکھا۔ تو بے اختیار ایک سوال اُس کے لبوں پر اُبھرا:-

Who clipped the lion wings
And flead his rumps and pared his claws?

کشن سمیل پوری نے بھی فردوسِ وطن کے عظیم ستون پر سرزمین کشمیر کی شجاعت اور رعنائی کے "اُرٹن شیر" کا ایک حسین مجسمہ نصب کیا ہے جسے دیکھ کر ہر "ایلیٹ" انگشت بدنداں رہ جائے گا۔ کشن سمیل پوری صرف شاعر ہی نہیں۔ حُبِّ وطن کا پیامبر بھی ہے۔ اگر وطن کی محبت کا جذبہ اُس سے الگ کر دیا جائے تو کشن ۔۔ کشن نہیں رہے گا۔ اور اُس کی ذہنی کاوشوں کی کیفیت اُس مجموعۂ گل " سے مختلف نہ ہوگی۔ جس کی مہک جھیل ڈل کی مُرغابیوں کے قافلے کی مانند وادیٔ کشمیر میں برفباری کے آثار دیکھ کر ہجرت کر چکی ہو ۔

گوپال نگر جالندھر

۲۱ جنوری ۱۹۶۱ء

حاضر و ناظر!

کلی کلی میں ہے تیری خوشبو
چمن چمن میں بہار تیری
ملی ہیں چشمِ طلب کو ہر سو
تجلّیاں آشکار تیری

یہاں بھی تُو ہے، وہاں بھی تُو ہے

ہر ایک دِل میں ہے تیرا مسکن
ہر ایک لب پہ ہے نام تیرا
ہر ایک عالم ہے تجھ سے روشن
کہاں نہیں فیضِ عام تیرا؟

عیاں بھی تُو ہے، نہاں بھی تُو ہے

شعر و نغمہ کی دیوی سے!

عزیزوں نے بیگانگی مجھ سے برتی
بزرگوں نے مجھ کو نظر سے گرایا
ہوس کہہ کے میری محبّت کو اکثر
رقیبوں نے کیا کیا تمسخر اُڑایا
مری زندگی ہو گئی تنگ مجھ پہ
زمانے نے رہ رہ کے وہ قہر ڈھایا
اُٹھیں اُنگلیاں مجھ پہ چاروں طرف سے
وہ دیوانہ آیا! وہ دیوانہ آیا!
برستی رہیں بجلیاں پے بہ پے بھی
مگر لب پہ میں حرفِ شکوہ نہ لایا

مری راہ پُر پیچ تھی، پُر خطر تھی
مصائب نے ہر چند مجھ کو ڈرایا
مگر میرا مقصد رہا رُو بہ رُو ہی
قدم ڈگمگایا، نہ میں لڑکھڑایا

جھکانا تھا سر تیرے قدموں میں مجھ کو
یہی شوق آخر مجھے کھینچ لایا!
حسد۔ بغض۔ کینہ۔ تعصّب۔ حقارت
کسی کو نہ میں نے کبھی منہ لگایا
عداوت کو چھوڑا۔ مٹایا دوئی کو
محبّت میں سب کچھ فنا کر دکھایا
غرض یہ کہ اے شعر و نغمہ کی دیوی!
تجھے جان پر کھیل کر میں نے پایا



رنگِ چمن

اس شان سے نکھرا ہے مرا باغِ وطن آج
فردوس سے بھی بڑھ کے ہے کچھ اس کی پھبن آج
ہر نخلِ چمن نور کا فوّارہ ہے۔ واللہ
پھولوں بھری ہر بیل ہے سورج کی کرن آج

مُدّعائے ہستی!

الم دے، رنج دے، اندوہ دے۔ غم دے، مُصیبت دے
نہ دولت دے۔ نہ شہرت دے نہ عزّت دے۔ نہ راحت دے
مجھے آفت پہ آفت دے، اذیّت پر اذیّت دے
گرفتارِ بلا ہردم رہُوں، پل بھر نہ فُرصت دے
ہمیشہ فاقہ مستی ہی میں گُذرے اَے خُدا، لیکن
مُجھے اپنی محبّت دے۔ عقیدت دے۔ عبادت دے
مہ وانجم کے جلووں سے عیاں تنویر تیری ہی
نسیم فصلِ گُل کی مَوج میں تاثیر تیری ہی
ہراِک صُورت، ہراِک منظر فقط تصویر تیری ہی
ہراک ذرّہ ہے مجھ کو جنّتِ کشمیر تیری ہی
ترا مجنُوں ہُوں، دیوانہ ہُوں، سُودائی ہُوں، پاگل ہوں
مرے اِس عشق کو کچُھ اور وُسعت، اور وُسعت دے
مہاشوں، پیشواؤں، پنڈتوں، خواجوں کی دُنیا میں
قدم رکھُوں نہ میں راجوں مہاراجوں کی دُنیا میں

نہ سرداروں کی دُنیا میں، نہ سرتاجوں کی دُنیا میں
مرا شیوہ ہو خدمت صرف، محتاجوں کی دُنیا میں

بدی کی راہ کو سمجھوں، ہمیشہ راہ دوزخ کی
رہوں سرگرمِ کارِ خیر۔ مجھ کو ایسی، ہمّت دے

یہی دِل کی تمنّا ہے۔ کہ مظلوموں کے کام آؤں
کھلادوں مانگ کر بھوکوں کو، خود فاقوں سے مرجاؤں
بلا سے مشکلوں کا سامنا ہو، میں نہ گھبراؤں
ہمیشہ بے کسوں کی، بے غرض خِدمت کئے جاؤں

نہ آئے بھول کر بھی دل، شراب و رقص و نغمہ پر
جہاں تک ہو سکے نفرت کروں ان سے وُہ طاقت دے

کوئی زہر اب بھی لائے۔ تو میں آبِ بقا سمجھوں
کوئی جور و جفا ڈھائے۔ تو میں مہر و وفا سمجھوں
کوئی سختی سے پیش آئے۔ تو میں طرزِ ادا سمجھوں
کوئی نفرت سے ٹھکرائے۔ تو میں تیری رضا سمجھوں

نہ اپنوں سے عداوت ہو، نہ بیگانوں سے نفرت ہو
مجھے اَے مالکِ ارض و سما ایسی طبیعت دے

تسکینِ رحمت

جب آفتاب جا چُکا، حریم خواب گاہ میں
ہر ایک چیز غرق تھی، دلِ شبِ سیاہ میں
تمیز ہی رہی نہ کچھ، گدا میں اور شاہ میں
شگفتگی، فسردگی، سکوت کی پناہ میں
سکوت بھی شکستہ پا، عدم کی شاہ راہ میں
مگر مرا دلِ حزیں
ملول و بے قرار تھا
ہجوم یاس و رنج و غم
مرے گلے کا ہار تھا
خیال اُلجھ کے رہ گیا، فلک کی چال ڈھال پر
نظر گئی کمال پر، کبھی جمی زوال پر
ابھی ثواب کے، ابھی گناہ کے مآل پر
نہ صبر عہدِ رفتہ پر، نہ صبر دورِ حال پر
ذرا بھی رُک سکا نہ دل، یقیں سے اک خیال پر
معاً کسی نے غیب سے
کہا کہ ہوشیار ہو
کہوں میں شرحِ زندگی
عبث نہ بے قرار ہو

تلاشِ حق میں بے طرح، یہ تیری بے قراریاں
یہ آہ و نالہ و فغاں، مسلسل اشک باریاں
قدم قدم پہ ٹھوکریں، یہ ذِلّتیں، یہ خواریاں
ہوس کی دِل رُبائیاں، نفس کی سحر کاریاں
ہزار آزمائشیں، مگر وفا شعاریاں
نہ کچھ اثر دِکھا سکیں
نہ کوئی رنگ لا سکیں
نہ قعرِ پست سے تجھے
بلند تر اُٹھا سکیں
اگر ہے جُستجوئے حق، تو عمر یُوں تمام کر
نہ سیم و زر پہ جان دے، نہ حرصِ ننگ و نام کر
جنونِ تاج و تخت کیا؟ نہ یہ خیالِ خام کر
جہانِ چند روزہ میں، تو ایک خاص کام کر
یہی ہے کام کام کا، کہ خدمتِ عوام کر
یہ دیکھ پھر، خُدا نہیں
تجھی سے ہم کِنار ہوں
تری ہی غم گُسار ہوں
تری ہی جاں نثار ہوں

میرا وطن — ڈُوگّر!

[یہ نظم میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ڈوگرہ صدر سبھا جموں کے ایک سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔ سامعین نے اسے میری توّقع سے کہیں بڑھ کر پسند کیا —
ڈوگرہ سبھا نے اِس کے صلہ میں طلائی تمغہ مرحمت فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مقامی اخبارات نے اسے وسیع پیمانہ پر اشاعت دے کر ریاست کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا —]

توصیف سے بالا ہے، یہ خِطّۂ خوش منظر
رہتی ہے خجل اِس سے، رعنائیِ ہر کشوَر
ہر موجِ ہَوا اِس کی، ہے موجِ مئے کوثر
انداز فضا کے ہیں، کیف آور و جاں پرور
ہر نازِ دِل افزا ہے، ہر ایک ادا دِل بر
اُٹھتی ہی نہیں اِس سے، اُٹھے جو نظر اِس پر

فِردَوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن — ڈُوگّر

یہ رُوح فزا جنگل، یہ سبزۂ میدانی
دریاؤں کی، جھیلوں کی، ندیوں کی فراوانی
باغوں میں پرندوں کی، ہر وقت غزل خوانی
جھرنوں کی روانی میں، کیفیّتِ رُوحانی
کہسار کی ہر چوٹی، برفانی و نُورانی
خورشید بھی خود آکر، بھرتا ہے یہاں پانی

فردوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن — ڈوگر

دُرگا کا ٹھکانہ بھی، شنکر کا بھی یہ گھر ہے
عالم ہے شوالوں کا، دُنیائے منادر ہے
ہر ذرّہ مہِ انور، ہر خارِ گُلِ تر ہے
اِس دیس کا ہر کنکر، نیلم کے برابر ہے
یہ گلشنِ جنّت ہے، یہ چشمۂ کوثر ہے
ہر رنگ فسوں گر ہے، ہر شان فزوں تر ہے

فردوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن — ڈوگر

ہے بات ابھی کل کی ، کیوں کہئے پُرانی ہے
تاروں نے بھی دیکھی ہے، سورج نے بھی مانی ہے
اِس گُن بھری دھرتی کی، یہ سچّی کہانی ہے
یہ شیر ہے، وُہ بکری، اِک گھاٹ کا پانی ہے
وُہ کون سا خِطّہ ہے، آج اِس کا جو ثانی ہے
اِنصاف کی یہ بھُومی، ماضی کی نِشانی ہے

فردوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن — ڈوگرہ

گرمی کے مہینوں میں، وُہ ٹھنڈی ہَوا اِس کی
برسات کے موسم میں، وُہ کالی گھٹا اِس کی
وُہ چاندنی راتوں میں، پُرنُور فِضا اِس کی
دامن کشِ دِل و اللہ، ہر صبح و مسا اِس کی
جنّت سے یہ ہر پہلُو، عظمت ہے سوا اِس کی
تڑپاتی ہے حُوروں کو، ایک ایک اُدا اِس کی

فردوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن — ڈوگرہ

اِس خاکِ مُقدّس نے، اعجاز دِکھائے ہیں
جانباز گُلاب ایسے، چھاتی سے لگائے ہیں
رنبیرؔ سے عادِل بھی، پہلو میں بٹھائے ہیں
پرتاپؔ سے دانی بھی، گودی میں کِھلائے ہیں
سرباز ہزاروں ہی، دامن میں سُلائے ہیں
لاکھوں ہی گُلؔ و گوہر، سینے میں چھُپائے ہیں

فِردَوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن ــــ ڈُوگّر

گوکُلؔ ہے اگر جمّوں ۔ جمناؔ ہے توّیؔ اِس میں
متھرا کے نظارے ہیں، موجُود سبھی اِس میں
بادام ہی کیا، ماکھن، مِصری کی ڈلی اِس میں
ہر اِک کو میسّر ہیں، گھی، دُودھ، دہی۔ اِس میں
وُہ کون سی نعمت ہے؟ جس کی ہے کمی اِس میں
بنسی کی بھی تان آخر، اُڑ جائے کبھی اِس میں

فِردَوس سے بڑھ کر ہے
یہ میرا وطن ــــ ڈُوگّر

جمّوں

یہ پہاڑی، جس پہ جمّوں شہر اب آباد ہے
ایک جنگل تھی! گھنا جنگل! مجھے سب یاد ہے
بھیڑیے، چیتے، ہرن اور شیر پلتے تھے یہاں
طائرانِ خوش نوا رہتے تھے اس میں نغمہ خواں
گیت فرقت کے شبِ سیمیں میں گاتے تھے چکور
ناچتے تھے ہر طرف برسات کے موسم میں مور
رات دن اس میں سکوت و خامشی کا زور تھا
فاصلے پر دور دریائے توی کا شور تھا
سانپ، بچھو، اژدہے۔ ہر ہر قدم پر آشکار
شیر چیتے بھیڑیے۔ ہر سو قطار اندر قطار
آ نکلتا تھا اگر اس میں اکیلا آدمی
موت کے خطروں میں گھر جاتی تھی اس کی زندگی
دل لرز جاتا تھا، منظر ایسا دہشت ناک تھا
ذرہ ذرہ اس جگہ پُر ہول و وحشت ناک تھا

اِتفاقاً، راجہ جمبوؔ لوچن اِک دن ناگہاں
اپنے رستے سے جو بھٹکا، تو وُہ آنکلا یہاں
پیاس کی شدّت سے ایسی بن رہی تھی جان پر
تو لیتے تھے راجہ گم گشتہ کے اوسان۔ پر
وُہ بھٹکتا پھر رہا تھا جستجوئے آب میں
شعلہ زن تھی بے طرح آتشِ دلِ بے تاب میں
ہر نفس اُس کے لئے چلتی ہوئی تلوار تھا
دو قدم چلنا بھی اُس کو جان کا آزار تھا
پیاس کے عالم میں وُہ اُس سمت ہی کو چل دیا
جس جگہ نزدیک ہی پانی کا اِک تالاب تھا
دیکھ کر تالاب، اُس پیاسے کی باچھیں کھل گئیں
کوثر و تسنیم کی نہریں ہی گویا مل گئیں
اُڑ کے پہنچا پیاس کی شدّت میں وُہ تالاب پر
رہ گیا حیرت زدہ سا اِک نظارہ دیکھ کر
پی رہے تھے پانی، بکری اور شیر اِک گھاٹ پر
دنگ تھا وُہ، یہ حقیقت ہے، کہ افسونِ نظر؟
شیر کا بکری کے دِل میں بال بھر کھٹکا نہیں؟
شیر بھی بکری پہ جوشِ غیض میں جھپٹا نہیں؟

جانتا ہے شیر؟ پیاسے کو ستانا ہے حرام؟
پانی پیتے جانور کو پھاڑ کھانا ہے حرام!
یہ عجب جنگل ہے یارب جس کے کانٹے بھی ہیں پھول
شیر رہتے ہیں یہاں. لیکن ہیں پابندِ اصول
خوب دھرتی ہے، کہ ہے ہر چیز اس کی سر بلند
اس جگہ ظالم درندے بھی ہیں بے شک حق پسند
اس جگہ ایمان بھی ہے. رحم بھی. انصاف بھی
اس جگہ ہیں بکریوں پر شیر کے الطاف بھی

یہ نظارا ساری دنیا کو دکھانا چاہیئے
اس کو دنیا کی زیارت گھر بنانا چاہیئے

جمبو لوچن دل سے مفتوں ہو گیا اس دھام پر
اور جموں کی بنا رکھ دی خود اپنے نام پر
حکم راجہ نے دیا جنگل کے جنگل کٹ گئے
گھر بنانے کے لئے میداں میں رقبے بٹ گئے
آ گئے کھنچ کر یہاں معمار بھی۔ نجار بھی
ہو گئے آباد پھر مزدور بھی، نجار بھی
راستے. بازار. کوچے. گلستاں بننے لگے
ہر طرف تالاب، پل، مندر، مکاں بننے لگے

جب مکمّل ہو گیا یہ سلسلہ تعمیر کا
ہر طرف شہرہ ہُوا۔ اس خوش نُما تصویر کا
دیکھنے کو جلوہ دیہاتی کمر کسنے لگے
دُور سے آ کے لوگ اِس شہر میں بسنے لگے

دیکھتے ہی دیکھتے پھر شہر یہ بڑھنے لگا
ہر نیا سُورج ترقی کا یہاں چڑھنے لگا
مدرسے۔ کالج۔ منادر۔ ڈاک خانے۔ تار گھر
کھیل کے میدان۔ سینما ہال۔ گلشن خوش نظر
سیر گاہیں۔ چشمے۔ ٹیلیفون۔ برقی روشنی
ہر طرف رونق ہی رونق۔ ہر طرف آسودگی
چار سُو پھیلا ہُوا ہے اب یہاں سڑکوں کا جال
اب تو اِس جمّوں کی شہرت ہو گئی ہے لازوال
اور وُہ تالاب! راجہ کی بجھائی جس نے پیاس؟
اِک عمارت اب وہاں باقی ہے غمگین و اُداس
پُوجتے ہیں لوگ اُس کی خاکِ خوش آثار کو
ساتھ ہی تکتے ہیں حسرت سے درو دیوار کو



دریائے توی !

اے توی ! اے رشکِ گنگا ! اے بہارِ جاوداں
سرزمینِ ڈوگرہ کی رُوح پرور کہکشاں
تیری عظمت کا نہ ہو کیوں ہر سخن ور مدح خواں
اور کس ندی کو حاصل ہیں یہ رفعت کے نشاں
باپ واسک ناگ، سوج دھار ماں، ڈوگرہ وطن
چندر بھاگا کی سکھی، اوجھ اور نیرو کی بہن
ایک دن کیا جانے تیرے دل میں کیا آئی ترنگ؟
ہو گئی بیدار شاید نوجوانی کی اُمنگ
دیکھتے ہی دیکھتے بدلا کچھ ایسا رنگ ڈھنگ
باپ ششدر رہ گیا، حیران ماں، بہنیں بھی دنگ

---

۱ توی. اوجھ اور نیرو کا منبع ۔ ۲ وہ سلسلۂ کوہ جس پر واسک ناگ واقع ہے ۔ ۳ یہ ندی بالآخر دریائے چندر بھاگا سے مل جاتی ہے ۔

ماں نے چھاتی سے لگایا تو مچل کر رہ گئی
باپ نے ہنس کر بلایا تو اُچھل کر رہ گئی
کوہ سے اُتری مثالِ زُلف بل کھاتی ہوئی
مست ناگن کی طرح رہ رہ کے لہراتی ہوئی
پتھروں سے کھیلتی، ٹیلوں سے ٹکراتی ہوئی
ہنستی، اِٹھلاتی، تھرکتی، ناچتی گاتی ہوئی

بن گیا سُرمہ وہیں جب سنگ نے ٹوکا تجھے
گر پڑا وہ سر کے بل جب کوہ نے روکا تجھے

لیکن اپنی دُھن میں مست و محو سی رہتی ہوئی
مُشکلیں جو سر پہ آئیں راہ میں سہتی ہوئی
اجنبی بولی میں رُودادِ سفر کہتی ہوئی
اور منزل کے جنونِ شوق میں بہتی ہوئی

رفتہ رفتہ آخر آ پہنچی تو اُس نگری کے پاس
جس میں اِک مدّت رہا تھا تیرے دیوانے کا باس

اِس کھُلے میدان میں تُو صورتِ گُل کھِل گئی
مِل گئی جیسے کوئی کھوئی ہوئی جاگیر سی

سِمٹی شرماتی کو جب آسودگی حاصل ہوئی
چل پڑی کچھ اور بھی آگے اُچھلتی کودتی

ہر طرف دوڑی نگاہیں، کارواں در کارواں
سر جُھکائے چل پڑی کچھ بھی نہ پایا جب وہاں

اَے توی جو تیرے لب پر سیدھا سادا گیت ہے
گو پہاڑی گیت ہے۔ لیکن انوکھا گیت ہے
ہاں۔ انوکھا کیوں نہ ہو یہ، تیرے پی کا گیت ہے
دِل کُشا نغمہ ہے آخر۔ رُوح افزا گیت ہے

اِس کی دُھن سُنتے ہی کہسار و بیاباں جُھوم اُٹھے
ناچ اُٹھے طائر۔ تو انسان اور حیواں جُھوم اُٹھے



یہ اُجلے بُت سلَونی شام کی چادر سے نِکلے ہیں؟
کہ بہرِ سیر سارس سُرمئی ساگر سے نِکلے ہیں!

ا۔ اِسے اپنے محبُوب دریائے چناب کی تلاش ہے۔

مانسر ✝

سینے پہ کوہسار کے یہ خطّۂ جمیل
اور اس کے تین سمت فلک بوس اک فصیل
کچھ اس طرح رواں ہے اِسی میں حسین جھیل
جیسے کسی نے لاکے انڈیلا ہُوا ہو نیل

یہ آبِ خوش نظر جسے کہتے ہیں مانسر
تسنیم کا جواب ہے گویا زمین پر

یہ منظرِ جمیل ہے قدرت کا شاہکار
شاہ و فقیر جس پہ دل و جاں سے ہیں نثار
دیکھے تو کوئی جھیل سے کہسار کا یہ پیار
آغوش میں لیا ہے اسے ہو کے بے قرار

ساحل پہ ایک ایک نظارا ہے پُر فسوں
پاتا ہے اس جگہ دلِ مجروح بھی سکوں

ساحل کے ساتھ ساتھ لہکتا ہے سبزہ زار
ہر گُل جوابِ خُلد، ہر اِک خار گُل عذار

✝ ضلع جموں کی ایک حسین ترین جھیل

ہر سمت شاخسار، یہ چھائی ہوئی بہار
ہر شاخ پر طیور غزل خواں و نغمہ بار
موجوں کے ساتھ رقص میں گلہائے نیلوفر
رنگینیاں ہر ایک طرف تا حدِ نظر

مندر کے عین وسط میں بھگوان شام شام
کہسار ہیں، کہ جھیل کے دربان. شام شام
خاموشیوں میں، شام کے طوفان. شام شام
اور اُن کے درمیاں یہ بُتِ ماآن. شام شام

یہ آبِ نیل گوں ہے رواں اِس زمین پر
یا آسماں ہی تول رہا ہے حسین پر

یہ موسمِ بہار، یہ قدرت کا اہتمام
یہ بارشوں کا زور یہ سبزے کا فیضِ عام
باغوں میں یہ ٹپکتے ہوئے سرخ. زرد آم
پھر ناچتی، تھرکتی سی لہریں، یہ شام شام

ہاں دیکھ لے اگر یہ کوئی جلوہِ ایک بار
سو بار دیکھ کر بھی نہ آئے اُسے قرار

چناب کے ساحل کی ایک شام!

اے سمندر کے مسافر، چندر بھاگا، تیز گام
ابتدا سے نیک نام و بامراد و شاد کام
وجد میں لاتا ہے دل کو تیرا اندازِ خرام
کتنی رنگیں اور دل کش ہے ترے ساحل کی شام

سبزہ و گل سے مزین پربتوں کی چوٹیاں
جن میں سرسوں کی بسنتی لہلہاتی کھیتیاں
دونوں جانب جنگلوں میں کیف افزا تازگی
پربتوں کی چوٹیوں پر ہلکی ہلکی روشنی
اس فضا میں بھول جاتا ہے غموں کو ہر کوئی
دل کو اس ماحول میں ملتا ہے کیفِ سرمدی

سحر زا ہے کس قدر یہ منظرِ گل ہائے تر
محوِ حیرت ہے نظر جلووں کا عالم دیکھ کر

دُور تک اُس پار چیڑ اور دیوداروں کی بہار
سبزہ زاروں کی بہار، اور آب شاروں کی بہار
اُس طرف بستی ہیں نازک ماہ پاروں کی بہار
سیم تن پریوں کے جلوے، گُل عذاروں کی بہار

ذرّہ ذرّہ ہے جوابِ مہر و ماہ و مُشتری
کم نہیں فردوس سے رستوں کی شانِ دلبری

پربتوں کے دِل میں بھی ہے تیری عزّت کس قدر
تیرے قدموں میں جھُکے رہتے ہیں والہٰ اِن کے سر
جوش کے عالم میں آکر، تُو نے بل کھایا جدھر
ہٹ گئے پیچھے وہیں وُہ تیرا رستہ چھوڑ کر

کاٹتا ہے ہر کٹھن منزل بھی تُو دیوانہ وار
واقعی ہے پربتوں کی سلطنت کا تاج دار

تیرے ساحل پر ہے جو بھی نخل، وُہ گُل پوش ہے
جو بھی ہے مَوجِ ہَوا، سرشار ہے، مے نوش ہے
تیرے سحرِ نغمہ سے ہر ایک شئے مدہوش ہے
اِس ترنّم پر سکوں خود بھی سراپا گوش ہے

حوضِ کوثر؟ وہ ہے شرمندہ روانی دیکھ کر!
پانی پانی چشمۂ تسنیم پانی دیکھ کر!!

گھاٹ پر اُس پار کون اُترا وہ رشکِ ماہ تاب؟
مضطرب ہے جس کی پابوسی کو ہر اِک موجِ آب؟
اللہ اللہ. یہ ادا. یہ ناز. یہ حُسنِ شباب؟
چھُپ نہ جائے کیوں بدلیٔ تیرگی میں آفتاب؟

تاب لانا اُس کے جلووں کی کوئی آساں نہیں
وُہ تو خورشیدِ قیامت ہے رُخِ تاباں نہیں

واہ! یہ شوخی. یہ رنگینی - یہ حُسنِ لازوال
اور پھر موزونیت کا مُدعی ہر خدّ و خال
دیکھ لے چشمِ خیال اُس کو! یہ کیا اُس کی مجال
حُورِ جنّت ہو نہیں سکتی کبھی جس کی مثال

دل سے تم اے کِشن جس کے طالبِ دیرینہ ہو
آسمانِ شاعری کی یہ وُہی دیوی نہ ہو؟



بٹوت کی ایک شام

[یہ حسین و جمیل اور صحت افزا مقام۔ جموں سے ۷۸ میل کے فاصلہ پر۔ سری نگر کی راہ میں برلبِ سڑک واقع ہے۔ ڈوڈہ ۔ بھدرواہ اور کشتواڑ کو یہیں سے سڑک جاتی ہے۔]

ہوس فزوں ہو رات دن، نہ کیوں یہاں قیام کی
ہیں دل فریبیاں ہی کچھ، عجیب اس مقام کی
فضائیں ہر کہیں نہیں یہ چرخِ نیلی فام کی
ادائیں دل نشیں کہاں ہیں اور ایسی شام کی

وہ سامنے کی برف پوش پربتوں کی چوٹیاں
وہ چوٹیوں پہ ناچتی ہوئیں شفق کی سرخیاں

ادائے تیرگی میں ہے ضیا سمٹتی جا رہی
ہوائے عطر بیز وہ ہے نکہتیں لٹا رہی
سیاہیاں فسردگی کو ہیں گلے لگا رہی
جدھر بھی دیکھئے اُدھر ہے خامشی سی چھا رہی

بنوں میں طائروں کے چہچہے خموش ہو گئے
گھروں میں گُل رُخوں کے قہقہے خموش ہو گئے

کنارِ آبِ جُو مگر، ابھی تک ایک نازنیں
کھڑی ہے دیکھتی کچھ اِس طرف ملُول اور حزیں
گھڑا ابھی تو نہیں ہے اِس کے پاس، اور کیوں نہیں؟
تجھے گماں یہ ہے۔ وُہی نہ ہوں کھڑے وہاں کہیں؛

پٹک رہے ہیں جو تجھے کمال سے زوال پر!
کہیں نہ رحم آگیا ہو اُن کو تیرے حال پر؟

وُہی تو ہیں، کھڑے بہارِ حُسن کی دِکھا رہے
وُہی تو ہیں، سپاہیوں پہ نُور بن کے چھا رہے
اُنہیں کو دیکھ کہ تو ہیں یہ پھُول مُسکرا رہے
اُنہیں کے پاؤں پہ تو ہیں نجُوم سَر جھُکا رہے

اسیر پاس چل، قدم بڑھا، اور اُن کے پاس چل
وہ آ گئے ہیں جب تو کس لئے ہے تو اُداس، چل

ذرا ٹھہر مگر۔ بغور پھر وہ دیکھ تو سہی
کچھ اور چیز ہے کہ واقعی یہ ہیں کھڑے وُہی؟

تِرے جنوں کی بھی کشش اب تو حد نہیں رہی
ہر ایک شے تجھے فریب دے رہی ہے دَہر کی
تو کیسا کورِ چشم ہے، تو کیسا تیرہ بخت ہے
کہاں ہے نازنیں کوئی؟ وہ سَرو کا درخت ہے

مشاہدات:-

(۱)

ہری پرتاپ سین کی مہربانی میں نے دیکھی ہے
ہری سین کی ہری شاخِ جوانی میں نے دیکھی ہے
بالآخر خالدِ کشمیر کی سعیٔ جمیلہ سے
جواہر لال کی بھی قدردانی میں نے دیکھی ہے

(۲)

تصوّر میں ہے جو دولت پُرانی میں نے دیکھی ہے
مہاراجوں کی شانِ حکمرانی میں نے دیکھی ہے
مری آنکھوں نے اس فردوس میں کیا کچھ نہیں دیکھا
یہاں چترال کی بھی مہترانی میں نے دیکھی ہے

(۱) چترال کے حکمران کی بیگم

خُلد زارِ بھدروا ؟

{ صُوبہ جموں کی وُہ حسین وادی، جسے اُس کی رنگینیوں اور رعنائیوں کے پیشِ نظر کشمیر ثانی کہا جاتا ہے ۔ }

یہ خِطّہ، جو ہے اِک دُنیا ۔ سکُوں پرور نظاروں کی
جسے گھیرے ہیں ہر سُو سے فصیلیں کوہساروں کی
ملی ہے جس کے ہر پربت کو پوشش دیودا روں کی
جہاں رقصاں ہیں سو سو ناز سے پریاں بہاروں کی

نمایاں ہے اِک اک منظر سے جس کے راحت و شادی
یہی ہے وُہ بھدروا نام کی جنّت نما وادی

کوئی عالم ہو، لیکن عالم باغ و بہار اس میں
کوئی موسم ہو۔ لیکن ہر طرف ہی سبزہ زار اس میں
حیات افزا و جنّت کی ہوائے مُشک بار اس میں
ترستی ہیں جسے حوریں، وُہ حسنِ گُل عذار اس میں

کہیں ملتے نہیں دُنیا میں دِل کش مرغزار ایسے
بنائے ہیں یہیں قدرت نے کچھ نقش و نِگار ایسے

مہِ کامل یہاں جب رات کو ہوتا ہے نور افشاں
یہی وادی ہُوا کرتی ہے رشکِ گلشنِ رضواں
ضیا بن کر اُترتی ہیں فلک سے وہ حسیں پریاں
جو رقص و نغمہ سے کرتی ہیں واسک ناگ کو شاداں

وُہ واسک ناگ، جو ہے اُوجھ و نیرُو کا جنم داتا
تو ہی بھی ہے اُسی کی موہنی اور لاڈلی کنیا

درخشاں ہیں مثالِ کہکشاں سب رہ گذار اس کے
حسیں ہیں کوثر و تسنیم سے بھی جُوئے بار اس کے
دلِ شاعر پہ احسان و کرم ہیں بے شمار اس کے
نظر افروز۔ دل کش۔ جاں فزا۔ لیل و نہار اس کے

ہمیشہ جس غذا کو رُوح شاعر کی ترستی ہے
وُہ ان شادابیوں میں ہے بکثرت۔ اور سستی ہے

حسیں پریاں یہاں جب دھان بوتے گیت گاتی ہیں
بھدرواکی فضائیں سرخوشی میں ڈوب جاتی ہیں
ہوائیں بار بار اُن کے دوپٹوں کو اُڑاتی ہیں
گھٹائیں جھوم کر شانِ کرم اپنی دکھاتی ہیں

وفورِ کیف میں جب اُن کے تن من جھوم اُٹھتے ہیں
خُدا شاہد کہ سب کہسار. سب بَن جھُوم اُٹھتے ہیں

اَشعار :-

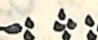
اُٹھو! زورِ ہمت سے کچھ کر دکھاؤ، ہِلا دو ازل اور ابد کے کنارے
زمانے میں جو انقلاب آ رہے ہیں، بھٹکنے نہ پائیں یہ دَر پہ ہمارے
کسی سے نہ لی دُشمنی مول ہم نے، نہ ہم دوستی کا کہیں قول ہارے
رہے چار دن گو زمانے میں لیکن، عجب شان سے ہم نے وُہ دن گزارے
بلاؤں میں گھِرا تھا جب اپنا سفینہ، تو ساحل پہ بیٹھے تھے تُم با قرینہ!
خدا لگتی کہنا کہ اہلِ کینہ! مدد کو کہیں ہاتھ ہم نے پسارے؟
وُہی نا خُدا نا خُدا ہیں مِری جاں، اماں جن سے مانگیں سمندر کے طوفاں
وُہ کیا جانیں، کیا چیز ہے نا خُدائی؟ ہے جن کی کشتی کنارے کنارے
مرا دِل بھی اَے سنگدِل سنگ ہوتا، تو کچھ ربطِ باہم کی صُورت نِکلتی
عجب کیا تھا دو پتھروں کی رگڑ سے، نِکلتے کبھی دن وفا کے شرارے

کشتواڑ کی ایک رات!

(دریائے چندر اور دریائے بھاگا کا مقامِ اتصال)

ہیں آبشار کے نغمے بھی، سبزہ زار بھی ہے
سکوتِ شب بھی ہے۔ دامانِ کوہسار بھی ہے
سرور خیز دمِ بادِ مشک بار بھی ہے
فضا اگرچہ ہے خاموش، خوش گوار بھی ہے
ردائے آبِ رواں پر یہ عکسِ نورِ قمر
ہے کس قدر نظر افروز اور نظر پرور
یہ کیفِ بے خودی و کنجِ لطفِ تنہائی
یہ شانِ خلوت و یکسوئی و شکیبائی
تخیلات کی رفعت، یہ عرش پیمائی
یہ کہکشاں کی ادائیں یہ حسن و رعنائی
یہ کیفیت نہ میسر اسے کبھی آئی
جو روح نے بخدا آج کل یہاں پائی

بہشت سے کہیں رنگین ہے یہ ویرانہ
مبالغوں سے مُبّرا ہے اِس کا افسانہ
ہیں اِس مقام کی ساری ادائیں مستانہ
نہ کیوں بنائے یہاں کی بہار دیوانہ
یہ کیف بار ہَوا۔ پھر یہ عام سَنّاٹا
یہی تو ہے دلِ مضطر سکون کی دُنیا



قطعہ:-

واعظ! ترا فردَوس بھی فردَوس ہے۔ لیکن!
کشمیر کی عظمت کی قسم ہم نہیں کھاتے
جنّت نہیں یہ خِطّۂ گُل پوش، تو کیا ہے؟
کِس دِن ثمرِ باغِ ارم ہم نہیں کھاتے!

سمبل پور

ہر وقت شیخ کو ہے غمِ خُلد، شوقِ حُور
مطلوب برہمن کو ہے اِچشم دروں کا نُور
رِندِ خراب حال ہے غرقِ مئے و سرُور
کوئی اسے سمجھ لے مرے ذہن کا فتور ــــ
سَو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمبل پور ــــ

بیٹھا رہوں میں زہرہ جمالوں کے درمیاں
یا خُلدِ شالا مار میں ہو بزمِ دوستاں
رہتی ہے اِس کی یاد مرے قلب میں جواں
نزدیک اِس سے ہوں، کہ رہوں لاکھ دُور دُور ــــ
سَو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمبل پور ــــ

یہ سرزمیں ہے رُو کشِ صد گلشنِ جناں
روشن اِسی کی خاک سے ہیں میرے جسم و جاں
موجود ہے[1] ابھی مرے گھر کا وہاں نشاں (؟)
جس کے کھنڈر ہیں آج بھی ہم تابِ کوہِ نُور ــــ
سَو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمبل پور ــــ

[1] اب تو اُس کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

تالاب کے کنارے کدمبوں کی وہ قطار
سنتو کھ ناتھ جی کی سمادھی کا وہ وقار
مندر کا وہ شکوہ، وہ ہر سمت جلوہ زار
رنگینیوں پہ ناز ہے، عظمت پہ ہے غرور
سو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمیل پور

اس پر نثار ہیں مرے جان و دل و جگر
کیا شے ہے اس کے سامنے دنیا کا مال و زر
چٹکی بھر اس کی خاک جو رکھ لے زبان پر
بن جائے وہ گنوار سخن دان ذی شعور
سو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمیل پور

یہ سچ ہے مدتوں سے گذر تک نہیں وہاں
اب اس جگہ نہ میری بہن ہے، نہ باپ ماں
اور اب بھی میرے حق میں نہیں دورِ آسماں
پھر جا بسوں وہیں، مری حسرت ہے یہ ضرور
سو جان سے عزیز ہے مجھ کو سمیل پور



مہاراجہ گُلاب سنگھ

رام گڑھی کو میسّر ہے یہ ڈوگرہ میں کمال
جس کے آب و گِل سے اُٹھّا تھا کبھی اِک نونہال
وُہ کِشورا سِنگھ کا نورِ نظر۔ فرخندہ فال
کھیلتے تھے ساتھ جس کے عظمت و جاہ و جلال
وُہ بہادُر، وُہ جری، وُہ پیکرِ مردانگی
جس کی نظروں سے عیاں تھی فتح کی دیوانگی
وہ چلا پنجاب کو جمّوں سے راہی کی طرح
فوج میں بھرتی ہُوا ادنیٰ سپاہی کی طرح
چھا گیا دُشمن پہ جب موجِ تباہی کی طرح
وُہ چمک اُٹّھا دِنوں میں تاجِ شاہی کی طرح
خالصہ دربار میں آخر ہُوا وُہ باریاب
گلشنِ رنجیت میں وُہ کھِل اُٹھا بن کر گلاب
شاہ کو ایسے پسند آنے لگے اُس کے صفات
مثلِ مہ۔ اُس مہر کے آگے تھا سب دربار مات
وُہ جو کہتا تھا۔ ہُوا کرتی تھی وُہ تسلیم بات
دِن کو دِن کہتا تو دِن تھا، رات اگر کہتا تو رات

ـــــ ایسا مفتوں ہو گیا اُس پر وہ شاہِ نیک بخت ـــــ
ـــــ سونپ ڈالا ہے اُسی کو گویا اُس نے تاج و تخت ـــــ
خود سروں نے سر اُٹھایا تو جھکا کر رکھ دیا
سازشی عنصر کو مٹی میں مِلا کر رکھ دیا
باغیوں کو اُس نے گولی سے اُڑا کر رکھ دیا
سلطنت میں امن کی جنّت کو لا کر رکھ دیا
ـــــ کون تھا ؟ جو اُس کی ہمّت پر مِٹا جاتا نہ تھا ـــــ
ـــــ والیِٔ پنجاب بھی اُس کی قسم کھاتا نہ تھا ـــــ
والیِٔ پنجاب کو اِک روز یہ آیا خیال
عام لوگوں میں کہاں ہوتا ہے یہ جاہ و جلال ؟
ہو بہو ہیں تاج داروں کے سے اِس کے خد و خال !
مستقل دولت سے کیوں اِس کو نہ میں کر دوں نہال ؟
ـــــ ذرّۂ خاکی چمک کر نیّر آرا ہو گیا ـــــ
ـــــ بس اُسی ساعت سے وُہ جمّوں کا راجا ہو گیا ـــــ
اور اِک دن والیِٔ پنجاب ہنستا کھیلتا
اُس کو اپنے ساتھ لے کر واردِ جمّوں ہوا
پاؤں اُکھڑے سرکشوں کے، رنگِ رُخ اُڑنے لگا
گونج اُٹھا آسماں، شیر آ گیا ! شیر آ گیا !

ہوگئے درشن کو حاضر مرد و زن اکھنور کے
چندر بھاگا کے کنارے اُس کے ڈیرے جم گئے
دُوسرے ہی روز جب دربار کا ڈنکا بجا
سر کے بل حاضر ہوا ہر فرد ڈوگرہ دیش کا
وسط میں میداں کے منڈپ سج رہا تھا بے بہا
تخت پہ رن جیت، پہلو میں گلابِ باوفا
والئے پنجاب نے ماتھے پہ پھر کھینچا تلک
وُہ گلابِ خندہ رُو، اور اُس پہ کیسر کا تلک
لیکن اُس سے ہوگئی تھی بات اک بے قاعدہ
اُس نے ماتھے پر تلک اوپر سے نیچے کو دیا
اُس سے جب پُوچھا کسی نے مُدعا اُس رمز کا
کھِل کھِلا کر ہنس پڑا وُہ اور یُوں کہنے لگا
"آبیاری کی تھی جس بُوٹے کی اِتنے سال تک
آج اُس کی جڑ کو بھی پہنچا دیا پاتال تک"
راجۂ جمُوں بنا جب وُہ گلابِ ذی وقار
راجے رانے جا بجا اس دیش میں تھے بے شمار
کوئی اپنے گاؤں کا حاکم تھا، کوئی شہریار
جو ستم گر تھا وُہ بن بیٹھا تھا خود ہی تاجدار

جابروں سے زندگی دوبھر تھی ہر معصوم کو
سر چھپانے کو جگہ ملتی نہ تھی مظلوم کو
دیکھی یہ صورت تو نکلا ایک دن گھر سے گلاب
ساتھ وُہ لشکر تھا، دنیا میں نہ ہو جس کا جواب
وُہ جہاں پہنچا، ہُوا دشمن کا زہرہ آب آب
ہر طرف سے مُلک میں گُونجی صدائے انقلاب
قصرِ سرکش کانپ اُٹھا، اُس کی گردن جھک گئی،
ظلم کی تلوار خود ہی چلتی چلتی رُک گئی
جانبِ لداخ پھر اُس کا قدم بڑھنے لگا
اُس نے اسکردو کو بھی، چترال کو بھی سر کیا
رفتہ رفتہ جب وُہ راجے سے مہاراجا ہُوا
سینۂ گلگت پر بھی اُس کا جھنڈا گڑ گیا
رُوس سے سرحد ملا دی اُس نے ہندوستان کی
دھوم ہر سُو مچ گئی دُنیا میں اُس بلوان کی



مہاراجہ رنبیر سنگھ!

زیبِ عنواں نام کرتے ہی ہری رَن بیر کا
سَر ادب سے جھک رہا ہے خامۂ تحریر کا
ہاں۔ وُہی رنبیر عادل۔ زینتِ باغِ گلاب
جس کا عہدِ عدل پرور۔ عہدِ بکرم کا جواب
صنعت و حرفت کا حامی۔ اہلِ فن کا قدرداں
اکبرِ اعظم سے برتر۔ غیرتِ نوشیرواں
کان پڑ جاتی سَر رہ جب ستم کش کی پُکار
شرطِ ہمدردی سے ہو جاتا دلِ اُس کا بے قرار
بارگہہ میں جس کی حاضر تھے بہت سے اہلِ کار
اور اپنے اپنے فن میں سب کے سب تھے ہوشیار
جوہری۔ تصویر کش، شاعر، نجُومی۔ نکتہ داں
مولوی۔ پنڈت۔ گوّیے۔ شہ سوار و پہلواں
جس کو حاصل تھا یہ ہر پہلوٗ سیاست میں کمال
کانپ اُٹھتے تھے غاصب دیکھ کر جاہ و جلال
رُعب ایسا، مُونچھ اگر اُس کی پھڑک اُٹھتی کبھی
شامت آ جاتی تھی اُس دن اِک نہ اِک غدّار کی

دبدبہ وہ۔ چور۔ ڈاکو۔ راہ زن سہمے ہوئے
لرزہ بر اندام ظالم، جابر، اُس کے نام سے
چیز اگر بھولے سے گر پڑتی کسی کی بھی کہیں
کوئی چھوتا تک نہ اُس کو، وہ پڑی مِلتی وہیں
جو بدل کر بھیس خود چکّر لگاتا شہر کا
دیکھتا یہ۔ کوئی دُکھ میں تو نہیں ہے مُبتلا
کوتوال۔ افسر۔ رعایا کو ستاتے تو نہیں؟
نام کو انصاف کے بٹّہ لگاتے تو نہیں؟
اُس کی ٹکسال اپنی تھی۔ اپنا ہی سِکّہ تھا رواں
اِک نرالی شان کا وہ حکمراں تھا بے گماں
آتے جاتے تھے جو کل تک فارسی حرفوں میں تار
اُس کے زرّیں عہد کی تھی وہ بھی روشن یادگار
یہ وزارت۔ پُلس۔ تحصیل۔ اور سارے محکمے
ڈاک خانے، مدرسے۔ مرکز رفاہِ عام کے
ہر عدالت۔ ہر عمارت، ہے اُسی کی یادگار
اور اُسی کا ضابطہ اب تک ہے ان میں برقرار
خوب تھا اُس جمّوں و کشمیر کے والی کا عہد
امن۔ خوش حالی۔ ترقی۔ فارغ البالی کا عہد

یوگی راج مہاراجہ پرتاپ سنگھ

(ایک چشم دید واقعہ)

گرمیوں کی دوپہر ۔ باغِ نشاط کاشمیر!
ہُو بہ ہُو فردوسِ پیکر، ہُو بہ ہُو جنّت نظیر!
رُوح پرور حوض، سبزہ، نہر، فوّارے، چنار
غم رُبا۔ راحت فزا۔ مے بار نغماتِ ہزار
ہر طرف اشجار جاں پرور قِطار اندر قِطار
غنچہ و گل شاخساروں پر، بہار اندر بہار
مخملیں قالین پہ ہر رنگ کے نقش و نگار
ہر کلی رشکِ چمن، ہر پھول تصویرِ بہار
ہر روِش کے پاس فوّاروں کے نغمے کیف بار
رقص کرتی آبِ جُو۔ ملہار گاتا آبشار
باغ میں ہر سمت مستانہ ہوا عنبر فشاں
جھُومتی۔ جھکتی لچکتی تھیں ثمرور ڈالیاں
کیف آور نکہتیں، رنگینیاں، زیبائشیں
رُوح افزا مستیاں، رعنائیاں، آرائشیں

آخری تخت پہ اک ٹی پارٹی کا اہتمام
دید کے قابل تھا یہ شاہانہ حُسنِ انتظام
شامیانوں کی وہ رونق، کرسیوں کی وہ بہار
پُر تکلّف نعمتوں کا تھا نہ کوئی بھی شمار
دیدنی میزوں پہ گلدستوں کی جاں پرور بہار
صاف مثلِ آئینہ ہر ایک طشتِ زر نگار
خشک و تر میوے بھی حاضر تھے مئے گلفام بھی
بن رہی تھی رفتہ رفتہ غرب میں اک شام بھی
ساغروں میں لے رہی تھی دُخترِ رز انگڑائیاں
راہ میں آنکھیں بچھائے منتظر تھیں کرسیاں
لیکن اس عشرت کدہ سے اک طرف، تھوڑی ہی دُور
بادشاہِ وقت، دریا دل، فقیرِ ذی شعور
ہر طرح کے فکر سے آزاد، لمبی تان کر!
سو رہا تھا ننگے سر، نرم اور نازک گھاس پر
جیسے عادی ہی نہ ہو وہ بالشِ کمخاب کا
اپنے بازو ہی سے اُس نے کام تکیئے کا لیا
سادہ۔ بالکل سادہ سی پوشاک تھی زیبِ بدن
رُوئے روشن سے نمایاں تھے نہ آثارِ محن

جیسے تخت و تاج سے اب اُس کا دل بے زار ہو
سلطنت کو چھوڑ کر، بن کے لئے تیار ہو

گونج اُٹھی یک بہ یک جب تان شاہی بینڈ کی
ہو گئی کافور نیند، اور آنکھ اُس کی کھل گئی
وہ اُٹھا۔ اور اُٹھ کے دوڑائی اُسی جانب نظر
شوق سے تھے منتظر اُس کے سبھی خادم جدھر
پھر پہنچ کر پاس یہ پوچھا! کہ مہماں آ گئے؟
عرض کی سب نے کہ ہاں، اے ظِلّ سبحاں آ گئے!
سر جھکا کر اِک مصاحب نے کہا پھر شاہ سے
وائسرائے آ رہے ہیں! عنقریب آ جائیں گے
خیر مقدم کے لئے وہ کچھ قدم آگے بڑھا
اور اپنے ساتھ لے آیا اُسے ہنستا ہُوا
نیشنل اینتھم کی دُھن کے بعد، سب تعظیم سے
با ادب، چُپ چاپ، دعوت گاہ کی جانب بڑھے

بے خودی میں ساغر و مینا گلے ملنے لگے
عشرت و عیش و خوشی کے پھول یوں کھلنے لگے

رونقیں تھیں، قہقہے تھے، اور عشرت خانہ تھا
الغرض سب کچھ وہاں تھا، وہ شہِ دانا نہ تھا
جا چکا تھا شوق سے پھر کنجِ تنہائی میں وہ
محو رہتا تھا سکوں کی بزم آرائی میں وہ
دل سے تھیں محبوب اُسے زہد و سخا کی مستیاں
ہیچ تھی اُس کی نگاہوں میں شرابِ ارغواں
راہِ عشرت میں قدم وہ تو اُٹھاتا ہی نہ تھا
عَیش کی پریوں کو پاس اپنے بُلاتا ہی نہ تھا
جانتا تھا، دہر میں ہر ایک شے ہے بے ثبات
اُس کے دل پر خوب روشن تھے رموزِ کائنات
وہ سمجھتا تھا کہ ہے شانِ حکومت عارضی
ہر تکلّف عارضی، ہر جاہ و حشمت عارضی
صُلح کُل، حق آشنا، عادِل، سخی، ہر دلعزیز
پارسا، زاہد، فرشتہ، نیک خو، والا تمیز
گو بظاہر جموں و کشمیر کا سرتاج تھا
چشمِ حق بیں میں مگر وہ ایک یوگی راج تھا

مہاراجہ ہری سنگھ کا نعرۂ حق!

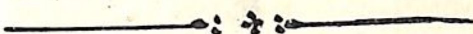
لندن کی وُہ گول میز کانفرنس، آزادیٔ ہند کی
تاریخ میں بلا شبہُ ایک مایُوس کُن حادثہ تھی۔ جس میں
برطانوی سیاست دانوں نے ہندوستانی والیانِ
ریاست۔ اور ہندوستان کے دیگر وطن دشمن عناصر
کی امداد وحمایت کی اُمید پر ہندوستان کو ٹکڑے
ٹکڑے کر کے آزاد کر دینے کی تجویز پیش کی ——
ہندوستان کے باغی فقیر مہاتما گاندھی نے انگریز
کی اِس شاطرانہ چال کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے۔
اور اِس کے ساتھ ہی مہاراجہ ہری سنگھ والئے
ریاست جمُوں و کشمیر نے — ہندوستانی والیانِ
ریاست کی نمائندگی کرتے ہُوئے صاف صاف کہہ
دیا۔ کہ ہندوستان کا کوئی بھی راجہ مہاراجہ آزادیٔ
ہند کے حصُول سے متعلّق کسی بھی قوم پرست
راہنما سے مختلف رائے نہیں رکھتا۔ اور کہ
اُنھیں تقسیم ہند کی یہ تجویز ہرگز تسلیم نہیں۔

[مہاراجہ ہری سنگھ کے اِس نعرۂ حق کی ہندوستان بھر کے اخبارات میں تعریف ہُوئی - قوم پرست ہندوستان نے اُنہیں دِل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا - اور اُن کے اِس نعرۂ حق کو آزادیٔ ہند کی تاریخ میں سُنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل قرار دیا — مندرجہ ذیل چند اشعار اُسی تاریخی واقعہ کے تاثّرات کا نتیجہ ہیں -]



ترے اظہارِ حق کو حق نُما کہنا ہی پڑتا ہے
تجھے حق دوست و حق آشنا کہنا ہی پڑتا ہے
تجھے اِک شیر دل فرماں روا کہنا ہی پڑتا ہے
بجا ہو بات جو، اُس کو بجا کہنا ہی پڑتا ہے
تری جرأت پہ ہم کو مرحبا کہنا ہی پڑتا ہے
سرِ دربار تُو نے صاف ہی منہ پہ یہ کہہ ڈالا
"دیارِ ہند کے ٹکڑے ہیں ناواجب! شبہ والا
کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی پنڈت، کوئی "لالا"
نہ پہنے گا گلے میں بھُول کر تقسیم کی مالا
حضُور - اِس حکم کو تو ناروا کہنا ہی پڑتا ہے"

نہ فخرِ قوم و ملّت ہیں، نہ ہم گوبند ثانی ہیں
مثالِ بھوج و بکرم ہیں، نہ عادل ہیں نہ دانی ہیں
نہ ہم خود داریٔ پرتاپ کی روشن کہانی ہیں
مہاراجے تو بے شک ہیں۔ مگر ہندوستانی ہیں
ہمیں تفریق کو اپنی قضا کہنا ہی پڑتا ہے



قطعہ

کسی ناچیز سے ذرّے کو تارا ہوتے دیکھا ہے
کسی تارے کو پل بھر میں دوبارا ہوتے دیکھا ہے
ہزاروں قسمتیں دیکھیں بگڑتی بھی، سنورتی بھی
بالآخر خشک و تر سب کو گوارا ہوتے دیکھا ہے

شہیدِ ملّت برگیڈیئر راجندر سنگھ؟

[وُہ بہادُر جس نے ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملہ کا
مقابلہ کرتے ہُوئے اپنی جانِ عزیز نچھاور کر دی
اور کشمیر کو بچا کر اپنا نام ہمیشہ کے لیئے زِندہ کرلیا]

وطن کے خادم بے لوث، قوم کے معمار
وفا شعار، عمل کوش، پیکرِ ایثار
صفاتِ حسنہ کا مجموعہ ہے ترا کردار
بجا ہے تجھ کو کہیں ہم جو کارواں سالار

ہر اِک مصیبت و مشکل میں رہ نما تُو تھا
ہماری ڈُوبتی کشتی کا ناخُدا تُو تھا

وفا۔ خلوص۔ محبت میں بے نظِیر تھا تُو
ستم زدوں کا بہی خواہ و دست گیر تھا تُو
امان و امن کا اِس ملک میں سفِیر تھا تُو
محافظِ چمنستانِ کاشمیر تھا تُو

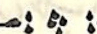
بجا۔ کہ چیر کے دِل ہم دکھا نہیں سکتے
مگر کبھی ترے احساں بھُلا نہیں سکتے

جنوں کے جوش میں جب غیر چڑھ کے آیا تھا
ہر ایک سمت جب اِک تہلکہ مچایا تھا
غریب خلق پہ بے وجہہ ظُلم ڈھایا تھا
قضا سے کھیل کے تُو نے ہمیں بچایا تھا

سِتم کے تیر سِتمگر نے جو چلائے تھے
وہ اپنے سینے پہ ہنس ہنس کے تُو نے کھائے تھے

شہید ہو کے دکھایا یہ تُو نے دُنیا کو
بہادر ایسے بناتے ہیں اپنے عُقبےٰ کو
وطن ارم سے سوا ہے وطن کے شیدا کو
نثار کرتا ہے اِس پر وہ ہر تمنّا کو

زمانہ ششدر و حیراں ہے اِس شجاعت پر
وطن کو ناز نہ کیوں ہو تری شہادت پر



فاتحِ گلگت جرنیل ہُشیارا کا پیغام!

(ہندوستانی نوجوانوں کے نام)

جس ڈوگرہ ویر نے بھارت کا، گلگت میں جھنڈا گاڑا تھا
رَن بھُومی میں جو جو دشمن، مُنہ آیا اُسے پچھاڑا تھا
افغانستان کی سرحد پر، جس نے سینا پہنچائی تھی
ہاں رُوس و چین کے دل پر بھی، جس شیر نے دھاک بِٹھائی تھی
جس کی ہمت پر طاقت پر، ارجن سے یودھا مرتے تھے
گلگت کے پربت تک جس کو، جھُک جھُک کے سجدے کرتے تھے

اِک رات وُہ جرنیل ہُشیارا، مجھ سے یہ خواب میں کہتا تھا
اَے شاعر آج اِس دھرتی پر، مَیں خُلد سے ناحق آ اُترا
گلگت بھی آ کر دیکھ لیا، چترال میں بھی گھُوم آیا ہُوں
جو ڈوگرہ خُون میں مہکی ہے، وُہ مٹی بھی چُوم آیا ہُوں
گلگت پہ قبضہ غیر کا ہے، چترال سے رشتہ ٹُوٹ گیا
یہ دیکھ کے ایسی ٹھیس لگی، دل بیٹھ گیا، جی چھُوٹ گیا
اُن راہوں میں جن ویروں کی، ہر سمت ہڈیاں بکھری ہیں
جن کی طاقت سے ہمت سے، دونوں دُنیائیں نکھری ہیں

گلگت کو غیر نے چھین لیا، جب نقشہ اُنہیں دکھاؤں گا
جنت' دوزخ بن جائے گی، اُف کیسی برق گراؤں گا

شاعر! تم مجھے بتاؤ گے؟ کیا گذری ڈوگرہ دیروں پہ؟
کیا بیتی راہ نماؤں پر' کیا گذری قوم کے ہیروں پر؟
گلگت کی قدر نہ کیوں جانی؟ بھارت کے نیتی دانوں نے!
اب تک اُسے واپس کیوں نہ لیا، بڑھ کر قومی مستانوں نے؟
گلگت جُدا، چترال الگ' لداخ پہ دُشمن چھایا ہے؟
جموں کشمیر کے نقشے میں، یہ کیسا تغیر آیا ہے؟

وُہ بات یہ کٹ مرنے والے، کیوں اپنا فرض بھلا بیٹھے
کیوں جان ہوئی اِتنی پیاری، جو دھرم سے ہاتھ اُٹھا بیٹھے

شاعر۔ تم آج ہی کہہ دینا' بھارت کے راج دُلاروں سے
جموں کے ویر سپوتوں سے' کشمیر کے چاند ستاروں سے
گلگت تمہاری سرحد ہے۔ پورا چترال تمہارا ہے
اُن کا آکاش تمہارا ہے۔ اُن کا پاتال تمہارا ہے
ہم نے جنہیں مر کر جیتا تھا، جیتے جی تم نے ہارے ہیں
یہ موت ہے زندہ قوموں کی' کتنے منحوس نظارے ہیں

گلگتّ پہ جھنڈا بھارت کا، دوبارہ جب لہرائے گا
اِس پر مر مٹنے والوں کو، جنّت میں کچھ چین آئے گا

اَشعار :-

جنوں تو ہم پہ طاری ہے سِتارو! تُم تو سو جاؤ
شبِ غم ہم پہ بھاری ہے سِتارو! تُم تو سو جاؤ

سحر تک شاعرو مرتاض جاگیں، اہلِ زر جاگیں
تمھیں تو نیند پیاری ہے سِتارو! تُم تو سو جاؤ

تڑپنا، تلملانا، لوٹنا کانٹوں کے بِستر پر
یہ عادت تو ہماری ہے سِتارو! تُم تو سو جاؤ

تُم اِس کے ساتھ کھو جاؤ حسیں خوابوں کی دُنیا میں
عروسِ شب تمھاری ہے سِتارو! تُم تو سو جاؤ

یہاں بیٹھا پروتا ہُوں ابھی میں ہار اشکوں کے
مرا یہ شغل جاری ہے سِتارو! تُم تو سو جاؤ

فاتحِ لداخ وزیر زور آور سنگھ

اَے شیرِ وطن! کوہ شکن قوم کے ہادی
دُشوار تریں معرکے سر کرنے کے عادی
جس سمت بڑھا تُو وہیں دھاک اپنی بٹھا دی
ہر ظُلم کے ایوان کی بُنیاد ہلا دی
یُوں راہیِ دوزخ کئے چُن چُن کے ستم گار
باقی رہا کوئی نہ جفا پیشہ، نہ عیّار

رگ رگ میں اُمنگ جذبۂ ایثار بسا کر
آئینہ صفا کا دلِ صادق کو دِکھا کر
تُو جام مئے حُبِّ وطن سب کو پلا کر
جمّوں سے چلا فوجِ ظفر مَوج سجا کر

کیلاش کے اُس پار کا یہ عزمِ سفر تھا
دل تھا ترا فولاد کا، پتھر کا جگر تھا

ہنگامِ سفر صبح کے تاروں نے دُعا دی
فطرت کے طرب خیز نظاروں نے دُعا دی
فردوس کی سرمست بہاروں نے دُعا دی
ہاں ماہ وشوں، لالہ عذاروں نے دُعا دی

یہ خوبیٔ تقدیر نے اعجاز دِکھایا
ہر کوہ نے قدموں پہ ترے سر کو جھکایا
بے خوف و خطر گھاٹیوں غاروں سے گُذرتا
ندیوں کے خطرناک کِناروں سے گُذرتا
شعلوں سے، بھبوکوں سے شراروں سے گُذرتا
دُشوار ترین راہ گذاروں سے گُذرتا

تبت کے پہاڑوں میں تُو اک روز دہاڑا
بھارت کا عَلم جنگ کے مَیدان میں گاڑا
ہر چند تجھے دِن نے کبھی رات نے روکا
آفاق سے اُتری ہوئی آفات نے روکا
ہر جادۂ پُرپیچ کے خدشات نے روکا
اِس بات نے روکا، کبھی اُس بات نے روکا

لیکن تو کسی خوف کو خاطر میں نہ لایا
شیروں کی طرح رن میں گرجتا ہُوا آیا

دشمن کا وطن۔ جنگ سے مسموم فضائیں!
آفات کے طوفان۔ مصائب کی گھٹائیں!
یخ بستہ ندی نالوں کی جاں سوز ہوائیں!
ہر سانس سے موت اور تباہی کی صدائیں!
کپڑوں کی کمی تھی، کہیں راشن کی کمی تھی
خیموں پہ کئی دن کی منوں برف جمی تھی

اس پہ بھی مگر تیرے وفادار سپاہی
جاں باز۔جری۔ طالبِ پیکار سپاہی
جنگاہ میں چلتی ہُوئی تلوار سپاہی
لڑتے ہُوئے کٹ مرنے کو تیّار سپاہی
دشمن کو کبھی پیٹھ دکھاتے نہیں دیکھے
رن سے وہ کبھی بھاگ کے جاتے نہیں دیکھے

اک روز مگر آہ ترے راج دُلارے
وہ بجلیاں، وہ آگ، وہ شعلے، وہ شرارے

سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے وہ بھوک کے مارے
اُس برف کے طوفاں میں امر ہو گئے سارے

جس حصّہ میداں میں قدم تیرا ڈٹا تھا
وہ چین دغا باز کی لاشوں سے اٹا تھا

آکاش کو چھوتی ہوئی وہ اجنبی دھرتی
نادیدہ و نامحرم و بیگانہ سی دھرتی
کیلاش پہ پھیلے ہوئے لاماؤں کی دھرتی
ہاں خونِ شہیداں میں نہائی ہوئی دھرتی

گاتی ہے تری شوکت و عظمت کے ترانے
کہتی ہے وہ اب بھی تری طاقت کے فسانے

نرگس نہیں فدا یہ گلِ لالہ زار پر
اُس شوخ کی نظر ہے دلِ داغ دار پر

فاتحِ چترال جرنیل باج سنگھ!

قلعۂ مستوج میں دس دن سے تُو محصور تھا
تیرا ہر بھوکا سپاہی فرطِ غم سے چُور تھا
فوجِ دُشمن سامنے تھی، دوست کوسوں دُور تھا
آہ تُو اُس وقت کتنا بے بس و مجبور تھا

اُس طرف فتح و ظفر کے قہقہوں کی موج تھی
اور اِدھر اِک بھوکی پیاسی ڈوگروں کی فوج تھی

تھا یقیں تجھ کو ابھی گلگت سے فوج آئے گی
اور آتے ہی وہ ظالم پر مصیبت ڈھائے گی
دیکھتے ہی دیکھتے یہ جنگ پلٹا کھائے گی
اور یہ بگڑی ہوئی تقدیر پھر بن جائے گی

دُشمنِ بے دِل سزا اپنے کیے کی پائے گا
پرچمِ ہندوستاں چترال پر لہرائے گا

تجھ سے اِک انگریز کرنل نے جونہی اِتنا کہا
"ڈوگرہ جرنیل بھی دُشمن سے آخر ڈر گیا؟"

اُس کا یہ طعنہ ترے دل کے لئے اِک تیر تھا
اور بھی کچھ جس سے بھڑکا شعلہ تیرے جوش کا
حکم صادر کر دیا ہاں. قلعہ کا در کھول دو
اور ابھی اے ساتھیو! دشمن پہ ہلّہ بول دو
حکم پاتے ہی وہ بھوکے شیر رن میں آ گئے
اور اعدا پر خدائی قہر بن کر چھا گئے
وہ چلی شمشیر بزدل خوف سے گھبرا گئے
ایسی بھگدڑ مچ گئی. مکّار لرزہ کھا گئے
شومیِ تقدیر سے. اے پیکرِ مردانگی
بھاگتے دشمن کی گولی تجھ کو سہوًا لگ گئی
تیرے جیتے جی وہاں لشکر ہمارا آ گیا
تو تھا جس کا منتظر وہ توپ خانہ آ گیا
اسلحہ. بارود. راشن. گھاس دانہ آ گیا
خچّروں پر ہر مسرت کا خزانہ آ گیا
نزع میں کرنل ہزارہ سنگھ سے تو نے کہا
یاد رکھ - لینا ہے بدلہ ڈوگروں کے خون کا

تازہ دم وُہ لشکرِ جاں باز میداں مارتا
باندھ کر سر سے کفن اغیار کو للکارتا
مُلک و مِلّت کے لئے جسم و دل و جاں وارتا
زخم کھاتا سینے پر۔ لیکن نہ ہمّت ہارتا
ابر کی مانند بڑھ کر چھا گیا چترال پر
کب اُٹھا رکھتے ہیں ضیغم کام ماہ و سال پر
اَے شہیدِ خطّۂ چترال جنرل پانچ سِین
قوم کی خود داری و عزت کی تصویرِ حسین
آفریں اے پیکرِ ایثار! ہمّت آفریں
رہتی دُنیا تک رہے گی یاد تیری دل نشیں
تُو نے ثابت کر دیا، تیرا کوئی ثانی نہ تھا
ڈوگروں کا خُون آخر خُون تھا، پانی نہ تھا



ماتر بھُومی سے!

ماتر بھُومی! مجھ کو تیرے جوشِ اُلفت کی قسم!
تیری عزّت کی قسم، تیری عقیدت کی قسم!
تیرے آب و گِل کے احسان و مُروّت کی قسم!
جو رواں تیری ہوا میں ہے اُس امرت کی قسم!
گھی، دہی، دُودھ اور ماکھن ایسی نعمت کی قسم!
تیرے ہر میدان، دریا، جھیل، پربت کی قسم!
تیری عالم گیر تقدیس اور عظمت کی قسم!

سوچتا ہوں، عہدِ ماضی کی وُہ عظمت اب کہاں؟
وُہ گلابِ شیر دل ایسی سیاست اب کہاں؟
وُہ ترے رنبیر کا رُعبِ عدالت اب کہاں؟
اور سر پرتاپ سنگھ ایسی ریاضت اب کہاں؟
زور آور سنگھ کی دادِ شجاعت اب کہاں؟
باج سنگھ، سوہنوں و ہشیارا کی جرأت اب کہاں؟
تیرے اُن جاں باز پروانوں کی شہرت کی قسم!

تیرے پنڈتوں کی وہ لاثانی دیانت اب کہاں ؟
رام کرشن و جہلا کی وہ عقل و حکمت اب کہاں ؟
تیرے درباروں میں بھوٹ بھٹا کی ظرافت اب کہاں ؟
وہ ترے ڈیڈو کی خودداری و غیرت اب کہاں ؟
تیرے دریا دل کنہیا کی سخاوت اب کہاں ؟
تیرے قدموں میں جو رہتی تھی وہ دولت اب کہاں ؟

تیرے عہدِ رفتہ کی اُس شان و شوکت کی قسم !

ماتر بھومی، کچھ تو کہہ تو، ہاں مجھے کچھ تو بتا !
اب تری اولاد کا یہ حالِ بد کیوں ہو گیا ؟
سارا عالم جس کی طاقت کا کبھی محتاج تھا
اپنے ہی گھر میں اُسے کوئی نہیں کیوں پوچھتا ؟
اہلِ دُنیا کی نظر میں کیوں نہیں اِس کی جگہ
کیا نہیں اِس کی رگوں میں اب لہو اسلاف کا ؟

ہاں بتا۔ تجھ کو مرے جذبِ محبت کی قسم ؟

کینہ و بغض و حسد، اِس میں کہاں سے آ گیا ؟
اِس کی عقل و فہم پر کیوں یہ اندھیرا چھا گیا ؟
کوئی آ کر کیا یہ اِس کے کان میں سمجھا گیا ؟

کیوں حصُولِ سیم و زر ہی اِس کے دل کو بھا گیا؛
اِس کی عیزت کو کیسے معلُوم ہے۔ کیا کھا گیا
ایسے جینے سے تو اے ماں اپنا جی اُکتا گیا

تُو نے جو بخشی ہے اُس شہرت کی دَولت کی قسم

ڈوگرہ تہذیب کا اِک اِک نِشاں مِٹنے کو ہے
اس کا نام اِس کا اَدب۔ اِس کی زُباں مِٹنے کو ہے
اپنے آبا کی مُنوّر داستاں مِٹنے کو ہے
زِینتِ اَوراقِ تاریخِ جہاں مِٹنے کو ہے
یہ زمیں مِٹنے کو ہے۔ یہ آسماں مِٹنے کو ہے
آہ۔ کیا معلوم اِسے ڈوگرّستاں مِٹنے کو ہے

اِس کی غفلت کی قسم، اِس کی جہالت کی قسم

قوم کو عظمت کے بھی قصّے سُنا کر رہ گیا
حُرّیت کے کتنے ہی نغمے بھی گا کر رہ گیا
آہ۔ فریاد و فغاں سے حشر ڈھا کر رہ گیا
اشک ہائے خُوں بھی میں برسوں بہا کر رہ گیا

تھک گیا ہیں۔ تو بالآخر تلملا کر رہ گیا
یہ نہ جاگی، مَیں اِسے برسوں جگا کر رہ گیا
بارہا مَیں نے اِسے دی تیری اُلفت کی قسم!

سیاسی لوری :-

ڈوگرہ بھومی کے شیرو! سُو رہو! سو رہو
اَے سیاسی مُفلسوں کے رہنماؤ! سو رہو
ایسی میٹھی نیند کا سُکھ کیوں لٹاؤ! سو رہو
ہاں سلامت تیرتی ہے اپنی ناؤ! سو رہو
دُور ہے طُوفاں ابھی اَے ناخداؤ، سو رہو!

کون کہتا ہے ابھی طوفان کوئی آئے گا؟
اور وہ آئے گا اے شیرو۔ تو دیکھا جائے گا
گھونسلے میں چیل کے وہ ماتس آکر پائے گا؟
فکر میں اپنا نہ تم یُوں سر کھپاؤ۔ سو رہو
دُور ہے طُوفاں ابھی اَے ناخداؤ، سو رہو!

ہاں تمہارے آباواجداد رن کے ویر تھے
ہُو بہو ارجن۔ کرن اور بھیم کی تصویر تھے
آہ کس درجہ کڑے اُن کی کماں کے تیر تھے
اُن کی شہ زوری کے دو اِک گیت گاؤ۔ سو رہو
دُور ہے طُوفاں ابھی، اَے ناخداؤ، سو رہو!

فردوسِ وطن!

جموّں کے خوش اطواروں کی زمیں، کشمیر کے فن کاروں کے وطن!
لدّاخ کے دیں داروں کی زمیں، تہذیبِ ثلاثہ کے مخزن!
گلزار نما تیرا ہر بَن
فردوسِ وطن!
فردوسِ وطن!!

ہندو، سکھ، مسلم، عیسائی، ہم سب تیرے دیوانے ہیں
ہر وقت ہمارے ہونٹوں پر، تیرے جاں بخش فسانے ہیں
اَے دافعِ دردورنج و محن
فردوسِ وطن!
فردوسِ وطن!!

تو حسن و جمال میں یکتا ہے؛ ہم مہر و وفا میں کامل ہیں
جو عشق ہیں تیری اداؤں پر، ہم اُن بندوں میں شامل ہیں
اَے مرکزِ علم و حکمت و فن
فردوسِ وطن!
فردوسِ وطن!!

تیرے پھولوں، کلیوں کی قسم ، سوگند ترے گلزاروں کی
تیرے شہروں، گلیوں کی قسم ، سوگند ترے مہ پاروں کی
تجھ پر ہیں نچھاور تن من دھن
فردوسِ وطن!
فردوسِ وطن!!
پانی میں ترے، امرت کا مزا ، مٹی میں محبت کی خوشبو
اس پر ایمان ہے دنیا کا ، فردوس ہے تو۔ فردوس ہے تو
حوریں بھی ہیں تیری دھن میں مگن
فردوسِ وطن!
فردوسِ وطن!!



برہنہ پا چلو کوسوں، کہیں کانٹا نہیں چبھتا
مقامِ فخر ہے ہم زعفراں زاروں میں بستے ہیں

نغمۂ کشمیر!

کشمیر کی تقدیر کے معمار ہیں ہم لوگ
تعمیر و ترقی کے پرستار ہیں ہم لوگ
بپھری ہوئی افواج کے سالار ہیں ہم لوگ
ہُشیار، کمر بستہ، خبردار ہیں ہم لوگ
کشمیر پہ کٹ مرنے کو تیّار ہیں ہم لوگ
حق یہ ہے، کہ چلتی ہوئی تلوار ہیں ہم لوگ
کشمیر کے بھی، ہند کے بھی ہم ہیں محافظ
فولاد کے کہسار کی دیوار ہیں ہم لوگ
دانا ہیں، اُٹھاتے ہیں قدم سوچ سمجھ کر
رہزن کی ہر اِک گھات سے ہُشیار ہیں ہم لوگ
ہاں دوست! ہمیں جنّتِ ارضی کے مکیں ہیں
خوش بخت ہیں، خوش فکر ہیں، فن کار ہیں ہم لوگ
دشمن کے مقدّر میں ہیں دوزخ کی بلائیں!
ہر نعمتِ فردوس کے حق دار ہیں ہم لوگ
کشمیر کی سرکار ہے سرکار ہماری
کشمیر کی سرکار کے سرکار ہیں ہم لوگ

اَے وادیٔ کشمیر!

تسنیم میں عکسِ رُخِ پُرنورِ جہاں گیر ——— اَے چشمۂ تاثیر!
اَے پیکرِ رعنائی و رنگینی و تنویر ——— اَے خُلد کی تصویر!
بیشک ہے تو خالق کے حسیں خواب کی تعبیر ——— اَے وادیٔ کشمیر!!

ہر سُو نظر افروز ہیں بِلّور کے کہسار ——— پُرسحر و فسُوں کار!
یا گوہر و نیلم کی ہے دیوار بہ دیوار ——— رنگین و ضیا بار!
یا مانی و بہزاد کے فردوس کی تصویر ——— اے وادیٔ کشمیر!!

بہتی ہوئی ندیوں میں فسُوں کار سے نغمے ——— سرشار سے نغمے!
پُرکیف فضاؤں میں طرب بار سے نغمے ——— بیدار سے نغمے!
سنگیت کی دیوی کے ہر اک نغمے کی تفسیر ——— اَے وادیٔ کشمیر!!

یہ شان ترے حُسن کی اَے منبعِ شادی ——— اَے زعفراں زادی!
اِس طرزِ تبسّم نے عجب دُھوم مچادی ——— دُنیا نے صدا دی!
اللہ رے یہ حُسنِ دل آویز کی تصویر ——— اَے وادیٔ کشمیر!!

کشفیؔ شمیل پوری

یہ جل پری، یہ اس کا تموّج، یہ ادائیں ——— کیوں دل پہ نہ چھائیں!
جنّت میں بھی شاید نہ ہوں یہ مست ہوائیں ——— مسرور فضائیں!
ہر چشمۂ شفّاف میں امرت کی ہے تاثیر ——— اے وادیٔ کشمیر!!

یہ پھول، یہ اشجار، یہ رنگین نظارے ——— جنّت سے بھی پیارے!
یا قوسِ قزح حسن کا گلزار سنوارے ——— پانی کے کنارے!
آئی ہے بڑھلنے کو ترے حسن کی تاثیر ——— اے وادیٔ کشمیر!!

یہ روح فزا باغ، دل و جاں سے بھی پیارے ——— آنکھوں کے ہیں تارے!
جو مرتے تھے تجھ پہ کسی حسرت کے سہارے ——— وہ ڈل کے کنارے!
تیرے لئے یہ گل کدے کرتے رہے تعمیر ——— اے وادیٔ کشمیر!!

وہ بیل، ہم آغوش ہے جو سرو جواں سے ——— اک ربط نہاں سے!
دیکھا، تو پلٹ کر میں چلا آیا وہاں سے ——— اس اپنے گماں سے!
ہیں نور جہاں اور جہاں گیر بغل گیر ——— اے وادیٔ کشمیر!!

سڑکوں کے کنارے یہ فلک بوس عمارات ——— پُر شان محلّات!
اللہ رے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات ——— کیا بات ہے کیا بات!
کشمیر کا کشمیر ہے گویا نئی تعمیر ——— اے وادیٔ کشمیر!!

؎ جھیل گگری بل کو معین احسن نے جل پری کا نام دے رکھا ہے

فردوسِ کشمیر!

فلک آشنا کوہ ساروں کی دُنیا — حسیں، نغمہ زن آب شاروں کی دُنیا
ملاحت ادا مرغ زاروں کی دُنیا — مسرّت فضا شاخ ساروں کی دُنیا
لہکتے ہوئیے سبزہ زاروں کی دُنیا — مہکتے ہوئیے لالہ زاروں کی دُنیا
دمکتے ہوئیے جوئے باروں کی دُنیا — چمکتے ہوئیے رہ گذاروں کی دُنیا
یہ پھولوں کی دُنیا، ہزاروں کی دُنیا — نشوں کی یہ دُنیا، بہاروں کی دُنیا
سفیدوں کی دُنیا، چناروں کی دُنیا — گھٹاؤں کی دُنیا، نظاروں کی دُنیا

یہ دریاؤں، جھیلوں، پھہاروں کی دُنیا
حقیقت میں ہے خُلد پاروں کی دُنیا

عجب ہے یہ دُنیا عجب سرزمیں ہے — ہر اک چیز اس کی جمیل و حسیں ہے
فلک نیلمی ہے، زمیں مخملیں ہے — سحر رُوح پرور، تو شب دِل نشیں ہے
فضا سحر پرور، ہوا عنبریں ہے — گلستاں کی اِک اِک کلی مہ جبیں ہے
ہر اِک قطرۂ آب حُسن آفریں ہے — ہر اِک ذرّۂ خاک زہرہ جبیں ہے
ہر اِک بیل بُوٹا جواں ہے حسیں ہے — ثمر ہے نبات اور گُل انگبیں ہے
سوا حُورِ جنّت سے ہر نازنیں ہے — مقابل بہشت اس کے کچھ بھی نہیں ہے

اندھیرے میں روشن نظاروں کی دُنیا
وہ شفاف پانی میں تاروں کی دُنیا

مکتوبِ کشمیر!

اگر تُم نے کبھی فردوس کا نقشا نہیں دیکھا
لبِ تسنیم و کوثر حُور کا جلوا نہیں دیکھا
اگر جنّت کے پھُولوں کا حسیں دستا نہیں دیکھا
ارم کی وادیوں میں دُودھ کا دریا نہیں دیکھا
— تو میرے دوست کچھ دن کے لئے کشمیر آجاؤ —

اگر تُم شاہ کارِ دستِ قدرت دیکھنا چاہو
اگر رُوئے زمیں پر باغِ جنّت دیکھنا چاہو
اگر کانٹوں میں بھی پھُولوں کی نکہت دیکھنا چاہو
اگر ذرّوں میں بھی نُورِ حقیقت دیکھنا چاہو
— تو میرے دوست! کچھ دن کے لئے کشمیر آجاؤ —

اگر دل میں وقارِ مُلک و مِلّت سے عقیدت ہے
اگر سچ مچ تمہیں تعمیرِ نَو سے کچھ محبّت ہے
اگر جذبہ ترقی کا تمہیں وجۂ مسرّت ہے
اگر یہ دیکھنا ہو ہمتّوں میں کتنی طاقت ہے
تو میرے دوست! کچھ دن کے لئے کشمیر آجاؤ



اَے خالدِ کشمیر!

اَے جنّتِ ارضی کی حکومت کے عناں گیر — اَے جانِ مشاہیر!
تہذیب کی، اِخلاق کی، اَخلاص کی تصویر — اَے صاحبِ تدبیر!
لاریَب ہے تُو ایک حسیں خواب کی تعبیر — اَے خالدِ کشمیر!!

وُہ خُلد نُما خواب، وُہ فِردَوسِ لقا خواب — وُہ کیف ادا خواب!
تعمیر و ترقی کا وہ اندوہ رُبا خواب — وُہ رُوح فزا خواب!
اب تیری بدولت ہُوا شرمندۂ تعبیر — اَے خالدِ کشمیر!!

یہ تیرے عزائم، تیری ہمّت کا اثر ہے — ہر ذرّہ گہر ہے!
پھر اپنا وطن امن کا آرام کا گھر ہے — دُنیا کو خبر ہے!
تُو ہی تو ہے اِس مُلک کا صُورت گرِ تقدیر — اَے خالدِ کشمیر!!

ہے واقعی یہ تیری ہی طاقت کا نتیجا — ہمّت کا کرشما!
تُو نے ہی ہر اِک کوششِ ممکن سے تو بدلا — اِس دھرتی کا نقشا!
ہر سمت یہاں پھیلی ہے تنویر ہی تنویر — اَے خالدِ کشمیر!!

ہے دھوم زمانے میں ترے جُود و سخا کی ——— اُلفت کی وفا کی!
ہاں عدل کی، انصاف کی، صدق اور صفا کی ——— ایک ایک ادا کی!
اَے جموں و کشمیر کے فردوس کی تنویر ——— اسے خالدِ کشمیر!!

ہنس ہنس کے تجھے شیخ و صنم دیکھ رہے ہیں ——— ہم دیکھ رہے ہیں!
اک ساتھ کھڑے دیر و حرم دیکھ رہے ہیں ——— ہم دیکھ رہے ہیں!
پھر جموں و کشمیر ہیں آپس میں بغل گیر ——— اَے خالدِ کشمیر!!

اَے قوم کے محسن ہو مبارک نیا پھاگن ——— ہنستا ہُوا گلشن!
سمن و گُل و غنچہ کا مبارک ہو یہ جوبن ——— صد حُسن بہ دامن!
سو بار مُبارک تجھے یہ عزّت و توقیر ——— اَے خالدِ کشمیر!!

شیخ کس منزل پہ ٹوٹا تار ذکر و شغل کا
وہ تری تسبیح کے دانے کہاں گم ہو گئے
رشکِ صد فردوس جب سے ہو گیا میرا وطن
تیری جنت کے وہ افسانے کہاں گم ہو گئے؟

کرشن سمیل پوری

ہاں! وُہ کشمیر ہمارا ہے!

بھارت کے شمالی گوشے میں، جو سُندر دیش دمکتا ہے
جس کا ہر پربت روشن ہے، جس کا ہر باغ مہکتا ہے
جس دھرتی پر ہر ایک طرف، امرت کے دریا بہتے ہیں
جس دھرتی کو دُنیا والے، فردوس کا نقشہ کہتے ہیں

ہاں۔ وُہ کشمیر ہمارا ہے!
ہاں۔ وُہ کشمیر ہمارا ہے!!

وُہ دیش، جو تاج میں بھارت کے، انمول چمکتا ہیرا ہے
جس کی مٹّی کا ہر ذرّہ، پارس، اکسیر، ممیرا ہے
جس کے آکاش کا ہر تارا، آنکھیں سُورج کو دکھاتا ہے
جس کی وایُو کا ہر جھونکا، پھُولوں کے شہر بساتا ہے

فردوس سے بھی جو پیارا ہے!
ہاں۔ وُہ کشمیر ہمارا ہے!!

جس کے میدانوں میں حق نے، مخمل کے فرش بچھائے ہیں
جس کے گلزاروں میں رب نے، سو سو فردوس دِکھائے ہیں

کشن سمیل پوری

حوریں راتوں کو جنّت سے، خود جس کی سیر کو آتی ہیں
ہر سمت بہاروں کی پریاں، سو ناز سے رنگ جماتی ہیں

جس میں اک خاص نظارا ہے!
ہاں۔ وہ کشمیر ہمارا ہے!!

خُلدِ بریں:-

جنّت کے فسانے سے ہُوا مجھ کو یقیں اور
کشمیر سا خطّہ نہیں برُوئے زمیں اور
حُوریں نہیں اِس میں، کہ فرشتے نہیں اِس میں
اِس مُلک کو ہم چھوڑ کے کیوں جائیں کہیں اور
واعِظ کبھی کشمیر کی بھی سیر تو کر لے
دُنیا ہی میں ہے دیکھ تو اک خلدِ بریں اور

محبوبۂ کشمیر سے!

کشمیر کے نظاروں کو تیری تلاش ہے
اے مہ جبیں، ستاروں کو تیری تلاش ہے
سبزہ ہے فرشِ راہ، گلوں کو ہے انتظار
سروِ رواں! ۔ چناروں کو تیری تلاش ہے
نذرانے جل پری کے خدا را قبول کر
پھولوں بھرے کناروں کو تیری تلاش ہے
یہ شالہ مار، یہ نشاط، یہ نسیم دیکھ
ہر سمت خلد پاروں کو تیری تلاش ہے
تو آپ روئے حسن ہے، ڈل کی خوشی ہے تو
چلتے ہوئے شکاروں کو تیری تلاش ہے
محرابِ بام و در میں ہیں قوسِ قزح کے رنگ
پُر کیف رہ گذاروں کو تیری تلاش ہے
دنیا کی وہ بہاریں، ترستے ہیں جن کو لوگ
اے شوخ اُن بہاروں کو تیری تلاش ہے
دنیا میں جن سہاروں کی ہے کشش کو تلاش
جلد آ ۔ کہ اُن سہاروں کو تیری تلاش ہے

راہ نمائے کشمیر سے!

یقیں کی برق، ہر شک و تذبذب پر گراتا جا
مثالِ ابرِ رحمت یاس کی دُنیا پہ چھاتا جا
مصیبت پر مصیبت لاکھ آئے مُسکراتا جا
وطن کی راہ میں ہنس ہنس کے ہر اک دُکھ اُٹھاتا جا

وطن کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

تعصّب کی بھڑکتی آگ کے شُعلے بجھاتا جا
وطن کے باغ میں فصلِ بہارِ اَمن لاتا جا
اخوّت کے ترانے عالمِ مستی میں گاتا جا
عوام اُلنّاس کو جمہوریّت کا گُر سِکھاتا جا

ظفر کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

ریا کے قلعے ڈھاتا جا۔ ہمیشہ دندناتا جا
صداقت کے محل کو آسمانوں تک اُٹھاتا جا
رہِ منزل سے چُن چُن کر ہر اک کانٹا ہٹاتا جا

بہاریں، رُوح پرور، کیف زا نغمے سُناتا جا

ظفر کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

مُخالف طاقتوں کا زورِ بازُو آزماتا جا
تُو نہیں کچھ اور اِن کو ڈِھیل دیتا جا۔ بناتا جا
گلہری کو پٹک دینے دے سرِ کوہِ فلک رس سے
سمُندر کی شِلا بن کر اِسے نیچا دِکھاتا جا

ظفر کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

ہزاروں مشکلوں کو اَپنے سینے سے لگاتا جا
حوادث کی صفوں کو چیر کر رستہ بناتا جا
ترے آگے چراغِ اعدا کے روشن ہو نہیں سکتے
تُو سُورج کی طرح اِن جگنُوؤں میں جگمگاتا جا

ظفر کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

وُہ ہو جائیں گے خود قائل کبھی کوتاہ بینی کے
کُوئیں کے مینڈکوں کو وُسعتِ منزل دکھاتا جا
چمن کے زاغ بھی ہو کر رہیں گے ہمنوا تیرے
ہمیشہ گُل پرستی کے اِنہیں نغمے سُناتا جا

ظفر کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

چلاتا جا تو اِک اِک گام پر اخلاص کی شمعیں
ریا و مکر کے گہرے اندھیرے کو مٹاتا جا
بس اِتنی اِلتجا ہے کِشن کی اے رہ نما تجھ سے
جگاتا جا وطن کا بختِ خوابیدہ، جگاتا جا

ظفر کے گیت گاتا جا، قدم آگے بڑھاتا جا

بات کرتا ہوں :-

نہ زاہد کی، نہ کچھ میں برہمن کی بات کرتا ہوں
فقط اِنساں کے پاکیزہ چلن کی بات کرتا ہوں
سُنے تو ہیں بہت رنگینیٔ جنّت کے افسانے
مگر اے شیخ، میں اپنے وطن کی بات کرتا ہوں

اِمامُ الہند مولانا آزاد کا جلوس

شخصی حکومت کے آخری ایّام میں - خُلد آشیانی مولانا آزاد - پنڈت جواہر لال نہرو اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفّار خان کے ہمراہ سری نگر تشریف لائے - آپ کی آمد پر نیشنل کانفرنس کی طرف سے ایک عظیم الشان دریائی جلوس نکالا گیا - شہر کے ساتوں پُلوں اور دریا کے دونوں کناروں کو نئی نویلی دُلہن کی طرح آراستہ کیا گیا تھا - سری نگر کے لاکھوں شہری اِس تاریخی جلوس سے محظوظ ہو رہے تھے - لیکن اِسی جلوس میں ایک جگہ مُٹھی بھر مُسلم لیگیوں کی ایک ٹولی نے آپ کے سامنے مخالفانہ مظاہرہ بھی کیا - یہ نظم مُسلم لیگیوں کی اُسی بیہودگی کے تاثرات کا نتیجہ ہے -

غضب کا تیر مارا - واہ وا - کیا چاند ماری کی
مُبارک لیگ والو ، کیسی اچھی شست کاری کی
گھر آئے میہماں پر دھُول پھینکی ، سنگ باری کی
رہِ حُبِ وطن میں اِک نئی تحریک جاری کی

لگے مُنہ بھی چڑانے اب وطن کے جاں نثاروں کا
فرشتوں، حق پرستوں، زاہدوں، پرہیزگاروں کا
امام الہند کی نکلی سواری ایسی شاہانہ
کہ ششدر رہ گیا کشمیر کا ہر اپنا بیگانہ
جلو میں اک طرف کعبہ تھا اور اک سمت بُت خانہ
رواں تھا ہر زباں پر ہند کی وحدت کا افسانہ

مگر تُم تو تڑپ کر رہ گئے یُوں اس نظارے سے
کسی نے جیسے گردن چیر ڈالی کُند آرے سے
معزز بیگمیں شرما گئیں اِس بے حیائی پر
زمیں میں گڑ گئے سب اہلِ غیرت اس ڈھٹائی پر
عوام الناس تھے حیراں زدہ اِس کج ادائی پر
معزز میہماں ہنستے تھے "لیگی" پارسائی پر

سیاست میں کبھی پستی، کبھی اقبال دیکھا تھا
مگر کب ایسا "پُر اخلاق" استقبال دیکھا تھا
کسے شک تھا تمہاری فطرتِ گم رہ کی پستی پر
اُڑائی دھول تم نے ہند کی ممتاز ہستی پر

کبش بسمیل پوری

تمہاری حرکتیں دھبا ہیں رُوئے حق پرستی پر
امام الہند تو بھاری ہیں مہر و مہ کی بستی پر
تعصّب میں ہر انساں نیک و بد کو بھول جاتا ہے
گنوارو۔ چاند پر تھوکا ہُوا تو مُنہ کو آتا ہے



اِلتماس :-

اہلِ شر کی پرورش ۔ اے اہلِ ہمت چھوڑ دو
فتنہ پردازوں پہ احسان و مُرّوت چھوڑ دو
بے ثمر ہو جو شجر اُس کی ریاضت چھوڑ دو
یاس دامن گیر ہو جس کی وُہ حسرت چھوڑ دو
بُغض و کینہ و رقابت کی حمایت ۔ وہم ہے
ہو اگر انساں تو انساں سے عداوت چھوڑ دو
حامیانِ امن کے ہو شوق سے حلقہ بگوش
دُشمنانِ امن سے لیکن عقیدت چھوڑ دو

فخرِ ملت کشمیر شہید محمد مقبول شروانی

کشمیر کی وُہ ممتاز ہستی - جس نے ۱۹۴۷ء کے
قبائیلی حملہ کے وقت درندہ صفت قبائیلیوں کے
ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرمایا -



زندہ ہیں، مگر اب تک کیا کیا، ہم اُسے شروانی بھول گئے
سرمست جوانی بھول گئے، بچپن کی کہانی بھول گئے
ہر تازہ فسانہ بھول گئے، ہر بات پُرانی بھول گئے
ہم عاشقِ نورِ جہاں کی بھی، ایک ایک نشانی بھول گئے

لیکن دِل میں محفوظ ہے جو، وُہ تیری ایک شہادت ہے
جس سے بچوں میں، بوڑھوں میں، جرأت ہے، جوش ہے، طاقت ہے

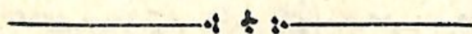
"نا پاکستان" کے جو وحشی، اس دھرتی پر چڑھ آئے تھے
جلاد تھے وُہ، سفّاک تھے وُہ، سوز حمت ساتھ وُہ لائے تھے
چھریاں، تلواریں ہاتھ میں تھیں، قاتل کا بھیس بنائے تھے
ہر بستی پر، ہر قصبے پر، اِک آفت بن کر چھائے تھے

اُن سے مِل کر غدّاروں نے، بارہ مُولہ لُٹوایا تھا
شیروانی۔ اُن کی سازش نے تجھ کو بھی قتل کرایا تھا

اَے شمع وطن کے پروانے، اے فخرِ وطن۔ اَے شانِ وطن!
تُو اپنی جان پہ کھیل گیا، ٹالا نہ مگر فرمانِ وطن!
اَے رُوحِ وطن، دلدارِ وطن، معمارِ وطن، اَے جانِ وطن!
پہنچایا عرش کی رفعت تک، آخر تُو نے ایوانِ وطن!

اَے اہلِ وطن، وقت آئے تو، یُوں مردِ مُجاہد مرتے ہیں
جب قوم کی آن پہ بنتی ہے، وُہ جان نچھاور کرتے ہیں
کشمیر کی دھرتی پر جب تک، نسلِ انسانی باقی ہے
سُورج میں، چاند میں، تاروں میں، جب تک تابانی باقی ہے
جب تک چشموں میں، جھرنوں میں، پُر کیف روانی باقی ہے
جب تک اِس کے گُلزاروں میں، نکہت سامانی باقی ہے

اِس دھرتی کے سب نر ناری، ہر وقت ترے گُن گائیں گے
شردھا سے تیری تُربت پر، پھُولوں کے ہار چڑھائیں گے



نوحۂ مہجور!

آہ۔ اے مہجورؔ! کشمیری ادب کے تاجدار
بلبلِ فردوسِ ارضی، شاعرِ عالی وقار
اے نئے کشمیر کے گلزار کی فصلِ بہار
یک بہ یک کیوں طبعِ نازک ہو گئی یوں بے قرار

سوئے صحرائے عدم کیوں چل دیا منہ موڑ کر
توڑ ڈالے دل، عدم سے تو نے ناطہ جوڑ کر

بے رُخی پر غنچہ و گُل کو پسینے آ گئے
کون جانے اِن پہ کیا گُذری؟ چمن مرجھا گئے!
مطلعِ کشمیر پہ وہ غم کے بادل چھا گئے
ہر دلِ مجروح پر جو بجلیاں برسا گئے

آج ہر دل میں اگر غم ہے، تو ہر دِل غم میں ہے
جس طرف اُٹھتی ہیں نظریں ہر کوئی ماتم میں ہے

آہ اے مہجورؔ، اے انسانیت کے غم گسار
طوطیِ گلزارِ معنی: شاعرِ فطرت نگار

تیرے ہر نقطے میں پنہاں نکتہ ہائے بے شمار
ہر غزل، ہر نظم، دُنیائے ادب کا شاہ کار

چل دیا تُو شاعری کو بے کسی میں چھوڑ کر
عرش سے اب کون لا سکتا ہے تارے توڑ کر

دردِ وطن!

ڈوگرہ سبھا ہی۔ ریاست جموں و کشمیر کی وہ اوّلین قوم پرست جماعت ہے جس کے بزرگ لیڈروں کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے حُبّ الوطنی کی تعلیم حاصل کی — یہ جماعت سمت ۱۹۶۱ بکرمی مطابق ۱۹۰۴ء میں سورگیہ شری لالہ ہنس راج وکیل نے قائم کی۔ اور مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ اور راجہ سر امر سنگھ نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی — اس کے ہر دور میں ریاست کی بلند پایہ ہستیاں اس کے ساتھ منسلک رہیں — ڈوگرہ سبھا نے اپنی زندگی میں کئی نشیب و فراز دیکھے۔ اس نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب دربار پر چھائے ہوئے مفاد پرست عنصر نے اسے ایک خالصتاً سیاسی جماعت قرار دے کر۔ مہاراجہ سر

پرتاپ سنگھ سے یہ حکم صادر کروا دیا۔ کہ ڈوگرہ سبھا میں کوئی سرکاری ملازم شامل نہیں ہو سکتا۔ اس نے وہ بخت بد بھی دیکھا۔ جب اس کے خلاف۔ حکمران کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی۔ کہ یہ سبھا چونکہ آل انڈیا کانگرس کے نقشِ قدم پر چلنے والی ایک باغی تنظیم ہے۔ لہٰذا اسے ایک خلافِ قانون جماعت قرار دیا جائے۔ اور بالآخر اس نے وہ منحوس دن بھی دیکھے۔ جب ۱۹۳۰ء میں۔ سورگیہ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے خلاف شہر میں ایک تاریخی احتجاجی جلوس نکالنے کی پاداش میں، اسے حکماً بند کرادیا گیا۔ اور ریاست میں فرقہ وارانہ سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے حکومت نے اس کے خلاف پابندی کا پہلا حکم منسوخ بھی کر دیا۔

ڈوگرہ سبھا کا ماضی شاندار کارہائے نمایاں سے درخشاں ہے۔ ریاست میں رشوت ستانی، بے کاری، بے گار۔ شراب نوشی۔ اور شادی صغیر سنی کے خلاف —— اور لازمی پرائمری تعلیم۔ کالجوں کے قیام۔ سٹیٹ بنک کے اجراء۔ پبلک نوٹیفکیشن میں ترمیم۔ اور پریس۔ اور پلیٹ فارم کی آزادی کے علاوہ ۱۹۲۳ء میں اسی قومی جماعت نے۔ ریاست میں نمائندہ قانون ساز اسمبلی کے قیام کے حق میں پہلی بار زبردست آواز اٹھائی —— چُناں چہ۔ یہ نظم بھی اُسی قوم پرست جماعت کے۔ ایک سالانہ اجتماع کی یادگار ہے —

کشمیر کے مشہور قومی راہ نما۔ اور چوٹی کے قانون دان۔ سورگیہ شری جیالال کلم جسٹس ہائی کورٹ صدر جلسہ تھے۔ جنہوں نے اِس حقیر نظم کے ایک ایک مصرعہ پہ جھوم جھوم کر داد دی۔ یہ وُہ زمانہ تھا۔ جب شیخ محمد عبداللہ صاحب کی فرقہ پرستی پر۔ ریاست کے پرائیم منسٹر سورگیہ شری گوپال سوامی آئینگر کی قوم پرستی کا جادو پُوری طرح اثر انداز ہو چکا تھا۔ چُناں چہ۔ نظم کے خاتمہ پر۔ جب شیخ صاحب پلیٹ فارم پر تشریف لائے۔ تو اُنہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ —— "بلاشبہ قوم پرستی کی زبردست لہر ہی۔ کسی مُلک کے عوام کی فلاح و بہبود کی حقیقی ضامن ثابت ہو سکتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس مُلک کے آب و گِل کو۔ کشن سمیل پوری ایسا قوم پرست شاعر پیدا کرنے کا فخر حاصل ہے۔ وُہ ملک۔ قوم پرستی کے میدان میں کبھی پیچھے نہیں رہ سکتا"۔ چُناں چہ۔ اِس نظم کے صِلہ میں۔ ڈوگرہ سبھا نے دوسری بار نیاز مند شاعر کو سُنہری تمغہ مرحمت فرمایا۔

نہ مُضطرب ہُوں کسی حُورِ سیم تن کے لئے
نہ بے قرار ہُوں دُنیا کے مال دھن کے لئے
نہ آرزُو ہے مجھے پیٹ بھر کے کھانے کی
نہ ڈھونڈتا ہُوں میں کپڑا کبھی بدن کے لئے

چھُپائے رکھتا ہُوں جنسِ وفا کو میں دِل میں
نہ ہے یہ شیخ کی خاطر۔ نہ برہمن کے لئے
خُدا کرے ۔ کہ وُہ وقت آئے ۔ اس کو صرف کروں
اس انجمن کے لئے، اور اس وطن کے لئے

خود اپنی جان تک اس پہ نثار کر دُوں گا
خزانِ قوم کو رشکِ بہار کر دُوں گا

نگاہِ دل میں ہے ۔ ماضی و حال کا نقشا
جو اِک عروج کا ۔ تو اِک زوال کا نقشا
یہ محض حُسنِ تصوّر ہے ۔ یا حقیقت ہے؟
یہ نقش نقش کا ۔ یہ بال بال کا نقشا
یہ ایک نقشا ہے تصویرِ یاس و ناکامی
مگر وُہ نقشا ہے جاہ و جلال کا نقشا
یہی تو پہروں رُلائے گا خوُن کے آنسوُ!
زوال سے ہے مُبدّل کمال کا نقشا

وُہ ایک وقت تھا، جب تھے وطن میں ہم خوشحال
یہ ایک وقت ہے جب ہیں وطن میں ہم پامال

یہ پوچھتا ہوں مَیں ڈوگرہ کے نوجوانوں سے
وطن کی عظمت و عزّت کے پاسبانوں سے
یہ اہلِ جموں و کشمیر میں ہے میرا سوال
ہر ایک مذہب و فرقہ کے نکتہ دانوں سے
دماغ اُڑتا ہے صنعت کے عرش پر جن کا
جو توڑ لاتے ہیں تارے بھی آسمانوں سے
وُہ خستہ حال بھلا کیوں خموش بیٹھے ہیں
جواب لٹکا ہے گھر جن کا زد کی کانوں سے

ہوئے ہیں کس لئے یوں آپ غیر کے محتاج
وُہ شے ہے کون سی حاصل نہیں جو آخر آج
سناؤں حالِ زبوں کیا میں کِشت کاروں کا
مزارعوں کا، کسانوں کا، بسوا داروں کا
یہ بے نوا ہیں۔ یہ محتاج ہیں۔ یہ مُفلس ہیں
گماں گذرتا ہے ان سب پہ سوگ داروں کا
جو گھر میں آدمی دس ہیں، تو ایک کمبل ہے
پھر اس پہ عالم سرما بھی کوہ ساروں کا
شریکِ حال نہیں کوئی بھی زمانے میں
اسی وطن کے وفادار جاں نثاروں کا

وفاپرست رہیں، جو وفا شعار رہیں
اُف۔ اپنے گھر ہی میں وہ یُوں ذلیل و خوار رہیں

مگر یہ عُقدہ ہے ایسا جو وا نہیں ہوتا
کوئی بزرگ بھی مُشکل کُشا نہیں ہوتا
کچھ ایسا اُلجھا ہے اِس مسئلے میں میرا خیال
ہزار سعی و عمل پر رہا نہیں ہوتا
یہ سوچتا ہُوں۔ غلط ہی نہ ہو کسی کا یہ قول
"کمر جو باندھ لے اِنساں تو کیا نہیں ہوتا"
وفا و عشق کے معنی بدل گئے شاید
جو آج کوئی بھی درد آشنا نہیں ہوتا

بھٹک رہا ہُوں پریشانیوں کی دُنیا میں
کہاں میں آگیا زِندانیوں کی دُنیا میں

تمام علم کو اب میں عمل میں لاؤں گا
اِس اپنے اُجڑے ہُوئے گھر کو پھر بساؤں گا
بنوں گا شمعِ ہدایت میں گُم رہوں کے لئے
جو سیدھا راستہ منزل کا ہے دِکھاؤں گا
جو بے خبر ہیں ابھی زندگی کے مقصد سے

اُنہیں میں درسِ خودی، شوق سے پڑھاؤں گا
بُجھیں گے. بُغض و تعصّب کی آگ کے شعلے
کچھ ایسی پریم کی گنگا یہاں بہاؤں گا

جیئوں گا. اور مروں گا. فقط وطن کے لئے
خیال و خواب ہیں سب لُطف اِس چمن کے لئے

ترقیات میں جو مُلک محوِ یکسر ہے
دماغ عرش پر اُس کا ہے. دِل فلک پر ہے
وُہ اِک ہمیں ہیں زمانے میں پست و خوار و ذلیل
سیاہ بختی سے پیروں میں جن کے چکّر ہے
ہمیشہ مسئلہ سعد و نحس ہے درپیش
مخالفت پہ ہے منگل. کبھی سنیچر ہے
مگر جو خون میں گرمی ہو، تو یہ کوہِ اَلم
فقط ہے ذرّہ - پرِ کاہ کے برابر ہے

سفینہ کھیتے ہیں جو سرفروش دھارے پر
پہنچتے ہیں وُہی گرداب سے کنارے پہ

جو ہوش ہے، تو کوئی فن، کوئی ہُنر سیکھو
وُہ عِلم، جس سے بنے قوم راہ بہ سیکھو

غبارِ بُغض و حسد کو نکال کر دِل سے
امان و امن کی تدبیرِ کارگر، سیکھو
نگاہ ڈالو ہر اِک مُلک کی ترقی پر!
سِکھا رہی ہے بہت کچھ یہ، تم اگر سیکھو
بنا دے ہم کو عزیزِ جہاں کرم جس کا
خدا کے واسطے وُہ کسبِ بااثر، سیکھو

وطن کے عشق میں جو بے قرار ہوتا ہے
اُسی کے نام پہ عالم نثار ہوتا ہے

خیالِ حُبِّ وطن کچھ اگر نمایاں ہو
جو مرحلہ ابھی دُشوار ہے، وُہ آساں ہو
وطن کے گلشنِ ویراں میں وُہ بہار آئے
ہر ایک خار کے پہلو میں باغِ رضواں ہو
ہنسی اُڑائے ہر اِک نخل۔ نخلِ طوبےٰ کی
ہر ایک طائرِ شیریں نوا غزل خواں ہو
ہر ایک شام ہو اِس کی، اَودھ کی شامِ جمیل
ہر ایک صُبح، بنارس کی صبحِ خنداں ہو

الٰہی. قوم و وطن سے ہمارا پیار بڑھے
اُٹھیں کچھ ایسے قدم دہر میں وقار بڑھے

نغمۂ بیداری!

جوانی بسُرعت چلی جا رہی ہے ، بُڑھاپے کی منزل قریب آ رہی ہے
یہ فرسُودہ زیست اب تو بیکار ہی ہے ، وہ دیکھو قضا سر پہ مُنڈلا رہی ہے
تمہیں دیش بھُومی یہ سمجھا رہی ہے!
اُٹھو نوجوانو! — اُٹھو نوجوانو!!

جہالت کی تاریکیوں کو مٹاؤ ، اسے نُورِ صہبائے عُرفاں پلاؤ
ہر اِک سمت اُلفت کی گنگا بہاؤ ، کچھ اپنی لیاقت کے جوہر دکھاؤ
کچھ اپنی ذہانت کا سِکّہ بٹھاؤ!
اُٹھو نوجوانو! — اُٹھو نوجوانو!!

سِکھاؤ سبھی کو مسرّت کا جینا ، وقار، احترام. اور عزّت کا جینا
مُروّت کا، اُلفت کا، شفقت کا جینا ، شجاعت کا ہمّت کا جُرأت کا جینا
تمدّن کا - تہذیب و حکمت کا جینا!
اُٹھو نوجوانو! — اُٹھو نوجوانو!!

جو مُلک آج طاقت سے گھبرا رہا ہے ، وُہ کم ہمّتی کی سزا پا رہا ہے
جو سہ زور ہے وُہ بڑھا جا رہا ہے ، جو کمزور ہے آج پچھتا رہا ہے
زمانے میں اِک انقلاب آ رہا ہے
اُٹھو نوجوانو! — اُٹھو نوجوانو!!

دعوتِ عمل!

اب آنکھیں کھول، اُٹھ بیدار ہو، یا خود کشی کر لے
یہ دو ہی راستے ہیں۔ مُنتخب ان سے کوئی کر لے
دوراہے پر حیات و موت کے غافل کھڑا اکیلا ہے
کسی جانب بڑھا لے چل قدم اب دیکھتا کیا ہے
اُدھر نوّاب ہیں، سُلطان ہیں، سرمایہ داری ہے
اِدھر مزدور ہیں، دہقان ہیں، افلاس طاری ہے
اُدھر حرص و ہوا کی ظلمتیں ہیں، اور اندھیرا ہے
اِدھر صبر و قناعت کی ضیائیں ہیں، سویرا ہے
اُدھر کوشش ہے کمزور اور مُفلس کو مٹانے کی
اِدھر خواہش ہے سب کو ایک سطح نَو پہ لانے کی
اُدھر انساں کو انساں سے لڑانے والے لیڈر ہیں
اِدھر امن و اماں، تعمیر و راحت کے پیغمبر ہیں
اُدھر سر میں ہے سودا، جام زہرِ غم پلانے کا
اِدھر دل میں ہے ارماں کیف کی دُنیا بسانے کا
اُدھر نفرت سے اُلفت، اور اُلفت سے حقارت ہے
اِدھر نفرت سے نفرت، اور اُلفت سے محبّت ہے

اُدھر مکر و دغا کی آتشِ دوزخ بھڑکتی ہے
اِدھر اخلاص کے پھولوں کی اِک دُنیا مہکتی ہے
اُدھر دُکھ ہے، اِدھر سُکھ ہے۔ یہاں حق ہے، وہاں باطل
زیادہ سوچتے رہنا ہے لاحاصل، اب اے غافل
تذبذب کیوں ہے؟ چُن اِک راستہ، گرم سفر ہو جا
دوراہا چھوڑ دے اب، تُو اِدھر ہو، یا اُدھر ہو جا

قطعہ :-

اَے شیخ! جو تھی چیز زمانے میں کام کی
تُو نے لگا دی مُہر اُسی پہ حرام کی
صہبا و نغمہ، مُطرب و ساقی، کِنارِ جُو
ہے رشکِ صحنِ خُلد بہار اِس مقام کی
تُو آج پی کے دیکھ، کہ کُھل جائے تجھ پہ راز
جنّت ہے کام کی یہی دُنیا۔ کہ نام کی

جنونِ مذہب!

[۱۹۴۷ء کی اُس خونیں داستان کا ایک ورق۔ جب مذہبی جوشِ جنون نے ہندوؤں۔ سکھوں اور مسلمانوں کو کچھ وقت کے لئے درندہ بنا کر رکھ دیا۔]

جنونِ مذہب ہے کُفر یکسر ، یہ حشر برپا اُٹھا چکا ہے
حق اِس کی باطل پرستیوں پہ ، لہو کے آنسو بہا چکا ہے
گرنتھ ، انجیل ، وید ، قرآں ، سبھی کو ٹھینگا دکھا چکا ہے
یہ اُن کے دامن کی دھجیّاں تک ، ہوا میں سو بار اُڑا چکا ہے
یہ گوردوارے جلا چکا ہے ، یہ مندروں کو بھی ڈھا چکا ہے
یہ اینٹ سے اینٹ مسجدوں کی ، خود اپنے ہاتھوں بجا چکا ہے
بہت سی مرتاض ہستیوں کو ، فنا کا ساغر پلا چکا ہے
بہت سے پیروں کی گردنیں بھی ، ہنسی ہنسی میں اُڑا چکا ہے

یہ خونِ معصومیّت کا پیاسا۔ اِسی میں اکثر نہا چکا ہے
یہ پھول تو کیا کھلا سکے گا۔ ہزارہا گل کھلا چکا ہے

کِسی کی عصمت کا پاس کیسا؟ کسی کی عفّت سے واسطہ کیا؟
یہ کارناموں سے آدمی کو ، حریفِ شیطاں بنا چکا ہے

ہَوائے حرص و ہَوَس نے اِس کو، کچھ ایسا اندھا کیا۔ کہ توبہ!
یہ صنفِ نازک کو بھی خودی میں، یتیم و بیوہ بنا چکا ہے
وُہ سرزمیں، جس کے خادموں نے، بنایا تھا اُس کو رشکِ جنّت
بنی ہے اب شعلہ زارِ دوزخ! گھر اُن کے اُن سے چھڑا چکا ہے
تباہ و برباد کر دیئے ہیں، فہکتے، ہنستے ہُوئے گھرانے
بنا کے شرم و حیا کو بے گھر، یہ اُن کو در در رُلا چکا ہے
دِماغ جن کے تھے عرش پیما، وہ فرش پہ تنکے چُن رہے ہیں
جمیل و خود دار ہستیوں کو، یہ زہرِ قاتل پلا چکا ہے
بچھڑ گئی ہے کِسی کی بیٹی، الگ ہُوا ہے کِسی کا بیٹا
یہ ناچ ننگی کا سر خوشی میں، بڑے بڑوں کو نچا چکا ہے
نظامِ امن و سکوں میں اِس نے، وُہ زلزلے ڈالے ہیں، کہ توبہ!
ہماری تہذیب کے محل کو، یہ خاک تک میں مِلا چکا ہے
پلید کر دی ہے اِس نے یکسر، یہ بُدّھ و چشتی کی پاک دھرتی
یہ عِلم عرفاں کے واعظوں پہ، سیاہ دھبّے لگا چکا ہے۔

مگر مُبارک ہو ہند والو، کہ اب وُہ گمُراہ اور پاجی
تمہاری بیزاریوں کے صدقے، فنا کی زد میں خود آچکا ہے
اُٹھو لگاؤ وُہ ضربِ کاری، کہ اِس کا سر چُور چُور کر دو
اُٹھو، اُٹھو آج مِل کے اِس کو، حدُودِ عالم سے دُور کر دو

بھوؔ کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت

۱۹۴۳ عیسوی میں یہاں آٹے کا بھاؤ فی روپیہ ساڑھے تین سیر ہو گیا۔ اس ہوش رُبا گرانی سے عوام بلبلا اُٹھے۔ اس سانحہ مصیبت میں تخریبی عناصر کو حکومت کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے کا بہترین موقعہ ہاتھ آ گیا — جموں کی ہسٹری میں پہلی بار ہندو مسلم اتحاد کے رُوح پرور نظارے نظر آنے لگے۔ بھوؔ کے عوام نے شہر میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا۔ اور گندم منڈی میں پولیس نے نہ صرف اہلِ جلوس پر۔ بلکہ اس المناک سانحہ سے خوف زدہ ہو کر گلی کوچوں میں بھاگنے والوں پر بھی ان کا تعاقب کر کر کے گولیاں چلائیں۔ نتیجتہً نو اشخاص ہلاک اور دس زخمی ہوئے۔ حکومت کے خلاف عوام میں غم و غصہ کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ بازاروں میں ہڑتال ہو گئی۔ حکومت نے اس گولی کانڈ کی تحقیقات کے لئے ایک با اختیار کمیشن بٹھایا جس کے سامنے سرکاری اور غیر سرکاری گواہان کے بیانات قلمبند ہوئے۔ بالآخر ۵ جنوری ۱۹۴۴ء کو کمیشن کے ممبران مسٹر سین لیگل ایڈوائیزر، جسٹس ڈغونکر اور

جسٹس قاضی مسعود حسن نے اپنا فیصلہ سُنایا۔ نتیجتہً دو پولیس افسروں اور چودہ کانسٹیبلوں کو جلوس پر بلا وجہ گولی چلانے کی پاداش میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا کئی پولیس افسروں کو جبریہ ریٹائر اور تنزل کر دیا گیا۔ اور پولیس۔ سول اور جوڈیشل کے کتنے ہی حاکموں کی شدید ترین الفاظ میں مذمّت کے ساتھ انہیں محکمانہ سزائیں دی گئیں۔ شہیدوں کے ورثا کو آٹھ آٹھ ہزار روپیہ، اور زخمی ہونے والوں کو چار چار ہزار روپیہ کی رقوم دی گئیں اور شہر میں سستے اناج کی دُکانیں کھول دی گئیں ـــــ یہ نظم اُسی خُونیں حادثہ کی یادگار ہے +

گُماں کا اِشتہانے، توڑ ہی ڈالا فسُوں آخر
تعاون ہی میں پایا اہلِ جمّوں نے سکُوں آخر
ہوئیے سب فرقہ داری کے پھریرے سرنگوں آخر
ہُوا غرقِ ندامت مذہبی جوشِ جنُوں آخر

بہائی ہندو و مُسلم نے یک جا مَوجِ خوں آخر
وطن کی سرزمیں کو کر دکھایا لالہ گوں آخر
جب اُٹھا قحط کا طوفان نفرت کو بُھلا بیٹھے
ستایا بھوک نے جب تفرقے اپنے مِٹا بیٹھے

پرانی رنجشوں کو دفن کر بیٹھے، جلا بیٹھے
بالآخر گھوم پھر کر ایک ہی منزل پہ آ بیٹھے

قضا کے تیر تھک کر تھم گئے، لیکن نہیں اُٹھے
زمیں پر خون ہو کر جم گئے، لیکن نہیں اُٹھے

جلا ڈالا سراسر فرقہ داری کا وہ کاشانہ
رواں رہتا تھا جس میں بس بُھری خصلت کا افسانہ
بہم شیر و شکر آخر ہوئے ہیں دَیر اور بت خانہ
نماز اور آرتی میں اب ہوا مضبوط یارانہ

بہت کچھ آزما کر کج اداؤں بے وفاؤں کو
ہٹا کر رکھ دیا رستے سے جھوٹے رہ نماؤں کو

تمھیں یہ قحط و فاقہ کی گراں باری مبارک ہو
تمھیں افلاس و ناداری کی دشواری مبارک ہو
تمھیں یہ وقتِ مجبوری و ناچاری مبارک ہو
تمھیں پولیس والوں کی سیہ کاری مبارک ہو

زہے قسمت، جلا دی شمع زہریلی ہواؤں نے
تمھارا نام روشن کر دیا آخر بلاؤں نے

یہ خونی حادثہ ہے، کچھ تو اے اہلِ چمن سیکھو
پئے خلقِ خدا یوں باندھنا سر سے کفن سیکھو
یہ خو، یہ جذبۂ ایثار، یہ حُبِّ وطن سیکھو
خدا کے واسطے تم اِن شہیدوں کا چلن سیکھو

چمن پرور تو اپنا خون بھی آخر بہاتے ہیں
مگر غدّار بے غیرت چمن کو بیچ کھاتے ہیں



انجامِ حُسن

بُتو شباب کو اِک موجۂ ہوا سمجھو
چراغِ حُسن جو پُر نُور ہے بجھا سمجھو
تبسّمِ گُلِ رنگیں ہے شام تک سرِ شاخ
سحر ہوئی تو اُسے خاک میں ملا سمجھو

بے روزگار ــ اور ــ صُوبۂ بہار

یہ نظم ۔ میں نے ۱۹۳۸ئہ میں پٹنہ (بہار) میں کہی تھی۔ اور منشی معراج الدین احمدؔ۔ ایڈیٹر ہفت روزہ "پاسبان" جموّں نے اِسے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ اپنے مؤقر جریدہ میں شائع کیا تھا :۔

" حضرت کشنؔ سمیل پوری کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ سرزمینِ جموّں و کشمیر کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ اِس چرخِ کج نہاد کی ستم رانیاں، دُنیا میں انقلابات کا مُوجب ہُوا کرتی ہیں ۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے۔ کہ وُہ لوگ ۔ جو اِس سرزمین میں پیدا ہوُئے۔ اِس کی آغوش میں پلے اور پڑھے ــ لیکن مادرِ وطن کے یہ نونہال جب اِس قابل ہوُئے کہ اپنے وطن کی خدمت کر سکیں۔ تو جورِ زمانہ نے اُنہیں یہاں سے دُور ــ بہت دُور ــ ہزاروں میلوں پر تلاشِ روزگار کے لئے جا پھینکا ۔ آہ ! کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ کشمیر کی پُر بہار فضاؤں میں غیر مُلکی تو دِل کھول کر سانس لیں۔ مچلیں ۔ اور اپنی امارت کی

شان کو بلند سے بلند تر کرتے چلے جائیں. لیکن اس کی گود میں پرورش پانے والے وطن پرست شاعر۔ وطن سے بہت دور یادِ وطن میں تڑپا کریں ۔ حضرتِ کشن کی یہ نظم انہیں تاثرات کا نتیجہ ہے جو آپ کو صوبۂ بہار میں بیٹھے ہوئے ستا رہے ہیں ۔ دیکھئے اِن اشعار سے کس قدر حسرت ٹپک رہی ہے ۔

غربت. آہ و نالہ. بے صبری. ملالِ روزگار
قلب ویراں میں ہزاروں آرزوؤں کے مزار
سینکڑوں اندوہ و غم، رنج و الم. اور ایک دِل
ناک میں دم ! روح پژمردہ ! طبیعت مضمحِل !
اِک طرف ہر دوست کی بے اعتنائی کا خیال
اِک طرف اُس جانِ جاں کی بے وفائی کا ملال
داغِ فرقت، یاس و غم، پھر یاد دِلائے وطن
ماہیٔ بے آب جان و قلبِ شیدائے وطن
دستِ بخت بد سے اُمیدوں کا یکسر قتلِ عام
ہر جگہ، ہر سمت ہی ناکامیوں کے اژدھام
ہر قدم پر آفتوں کا ، ذِلتوں کا سامنا
ہر نفس چلتی ہوئی تلوار سے بھی کچھ سوا
جستجوئے رِزق میں شام و سحر گرمِ سفر

جان مضطر، دل دو پارہ، سینہ چھلنی۔ آنکھ تر
رُوح کانپ اُٹھتی ہے اہلِ زر کے تیور دیکھ کر
دل لرز جاتا ہے ہر حاکم کا دفتر دیکھ کر
پَے بہ پَے فاقوں سے ہے واللہ نقاہت کا یہ حال
اپنے سر کا بار اُٹھانا بھی ہوا جی کا وبال
اپنی صُورت آئینے میں دیکھتا ہُوں جب کہیں
سچ تو یہ ہے۔ مجھ کو آنکھوں پہ نہیں آتا یقیں
آئینہ دل کا عزیزوں کی نظر سے چُور چُور
مُفلسی کی زندگی جموُں سے دس سو میل دُور
کس طرح کٹتا ہے دن؟ کیوں کر بسر ہوتی ہے رات
چاہیئے پتھر کا دل سُننے کو یہ سب واردات
رُوح آوارہ کہیں ہے، اور ہے منزل کہیں
جسم بے جاں سا کہیں، نظریں کہیں ہیں، دل کہیں
پھُول، پھل، اشجار، گلشن، کوہ، میداں، بن نئے
رنگ و نسل و پوشش و اندازِ مرد و زن نئے
ہر نظر میں اجنبیت، ہر بشر نا آشنا
کون ہُوں میں؟ دُکھ ہے کیا؟ کوئی نہیں یہ پُوچھتا
شام تک کوئی بھی صورت آنکھ کو بھاتی نہیں
صبح تک دو چار لمحے بھی تو نیند آتی نہیں

جموّں کی یاد

جس طرح دریائے توّی کے کنارے ایک ٹیلہ پر شہر جموّں آباد ہے۔ ٹھیک اُسی طرح ہندوستان کا قدیم ترین شہر پٹنہ۔ جس کا پُرانا نام پاٹلی پُتر اور جسے شری گورو گوبند سنگھ کی جنم بھُومی ہونے کا فخر حاصل ہے دریائے گنگا کے کنارے بہارِ جلوہ دکھا رہا ہے۔ مجھے جب بھی کبھی شہر جموّں کے ساتھ پٹنہ کے محلِّ وقُوع کی یہ مشابہت دیکھنے کا اتفاق ہوتا۔ تو مجھے اپنے وطن کی یاد اور بھی شدّت کے ساتھ تڑپانے لگتی۔ چنانچہ یہ نظم۔ پٹنہ میں۔ دریائے گنگا کے کنارے بیٹھے ہُوئیے جموّں کی یاد میں پیدا ہونے والے جذبات کی ہیجان خیزی کی آئینہ دار ہیئے ؛

جہاں ملتی ہے حد۔ بھارت کے میدانی نظاروں کی
جھُکی ہیں جس کے قدموں پر جبینیں کوہ ساروں کی
جہاں سے ابتدا ہوتی ہے فردوسیں بہاروں کی
حیات افروز چشموں، جُوئے باروں آبشاروں کی

وُہ ٹیلہ سا، جو دریا کے کنارے پر درخشاں ہے
اُسی پر شہر جمّوں کا بہشتِ جلوہ ساماں ہے

وُہ پانی ہے، کہ ہے تاثیر امرت سر بہ سر جس کی
وُہ مٹّی ہے، بلائیں لیتے ہیں شمس و قمر جس کی
بنارس کی سحر سے بھی حسیں تر ہے سحر جس کی
اَوَدھ کی شام سے بھی شام ہے کچھ تازہ تر جس کی

خزاں میں بھی شگفتہ ہیں گُلوں کی بستیاں جس میں
سمٹ آئی ہیں ساتوں جنّتوں کی مستیاں، جس میں

وُہ ساون میں نظارے جاں فزا، کالی گھٹاؤں کے
وُہ پھاگن میں توی کے تٹ پہ جھرمٹ مہ لقاؤں کے
وُہ دن، پُر کیف دن! وُہ عطر زا جھونکے ہواؤں کے
وُہ راتیں، چاندنی راتیں، وُہ نغمے خوش اداؤں کے

فرشتے بھی اگر سُن لیں تو وُہ مسحُور ہو جائیں
اِسی جنّت میں بسنے کے لئے مجبُور ہو جائیں

ہمیشہ ماہ پاروں سے مکاں جس کے درخشاں ہیں
مثالِ کہکشاں صاف اور روشن جس کی گلیاں ہیں

بہاریں باغ جس کے غیرتِ گُل زارِ رضواں ہیں
حسیں، خوش لہجہ طائر جس کے، ہر بن میں غزل خواں ہیں

جہاں ہر ہر قدم پر شعریت موتی لُٹاتی ہے
اُسی کی یاد رہ رہ کر مرے دل کو ستاتی ہے

٭٭٭

قطعہ :-

کہیں نہ چین سے دم بھر ملا ٹھکانہ مجھے
کہاں کہاں لئے پھرتا ہے آب و دانہ مجھے
ہُوا ہُوں عالمِ غربت میں اِس طرح پامال
میں آشیانے کو روتا ہوں آشیانہ مجھے

عزمِ فرار

[صوبۂ بہار میں۔ روزگار کی صورت تو پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اُس اجنبی دیس میں میرا دل نہ لگتا تھا، ہر وقت یہی جی چاہتا۔ کہ کسی طرح اُڑ کے جموں پہنچ جاؤں۔ جہاں کی فاقہ مستی میں بھی ایک کیفِ بہترین پنہاں ہے اور کہ جہاں کے پتھروں کی ٹھوکریں بھی۔ کشمکشِ حیات میں ایک نیا ولولہ۔ اور ایک نئی اُمنگ پیدا کرتی ہیں — چنانچہ انہیں خیالات کی رَو میں بہتے ہوئے میں نے وہاں کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ایک ہی اُڑان میں۔ وسیع میدانوں۔ ندیوں اور نالوں کو پھلانگتا ہوا۔ میں جموں آ پہنچا۔ چنانچہ ذیل کے چند اشعار۔ صوبۂ بہار سے میری فراری سے پہلے کی کیفیت کے عکاس ہیں —]

برسوں نہ آئی یاد غریب الدیار کی
کیسی پھری نگاہ کبھی غم گسار کی
کشمیر میں وہ حُسنِ ازل سے ہے ہمکنار
میں خاک اُڑا رہا ہوں دیارِ بہار کی

دو سُرخ پھُول دیکھ کے نظروں میں جھُوم اُٹھیں
باغِ وطن کے صحن میں کلیاں انار کی
اُس کے رُخِ جمیل سے اُٹھتی نہیں نظر
جس سے مشابہت ہو ذرا حُسنِ یار کی
صحرا میں جُوئے شیر بہانے سے کم نہیں
پردیس میں تلاش کسی غم گُسار کی
چل اُس فصیلِ کوہ کے پار۔ اے دلِ حزیں
شاید وہاں ملے کوئی صورت قرار کی
اَے کشن۔ اِس دیار سے دل تنگ ہے تو۔ اُٹھ
آنکھیں بچھائے بیٹھی ہیں راہیں فرار کی



خوابِ رنگیں

بیاباں میں چھکتے خُلد پارے میں نے دیکھے ہیں
دِل آرا۔ دِل رُبا۔ دِل کش نظارے میں نے دیکھے ہیں
یہ کیسا خواب ہے؟۔ اِس خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟
وطن کی سرزمیں پر چاند تارے میں نے دیکھے ہیں

سرشتِ گیتی؟

برائی کو دنیا میں سردار دیکھا
بھلائی کو ہم نے نگوں سار دیکھا

جسے غم نصیبوں کا غم خوار دیکھا
اُسے غم میں اکثر گرفتار دیکھا

کِھلاتا ہے جو دِل کے غنچوں کو ہر دم
اُسے خوار مثلِ خس و خار دیکھا

جو سب کی بھلائی میں خوش ہے اُسی کو
اسیرِ غم و رنج و آزار دیکھا

وُہ زر دار ہے! جو ہے جہل مسکت
جو ہے بحرِ علم! اُس کو نادار دیکھا

رذیلوں کو پایا سرافراز۔ سرخوش
شریفوں کو جینے سے بیزار دیکھا

نظر آئی کوئی حقیقت تو اتنی
ہر اِک رنگِ عالم کو سَو بار دیکھا

جو دونوں جہاں کا بھلا چاہتا ہے
زمانہ اُسی کا بُرا چاہتا ہے



فصلِ بہار ـــــ اور ـــــ نخلِ مُراد

ہوا بہار کی لائی۔ وُہ جوش مستی کا
ورق اُلٹ گیا یک سر کتابِ ہستی کا
جہاں تھا تذکرہ پت جھڑ کی چیرہ دستی کا
رواں ہے قِصّہ وہیں اب گُلوں کی بستی کا

فلک سے اُترے ہیں پھر قافلے بہاروں کے
نظر نواز نظارے ہیں مرغزاروں کے

جوابِ صحنِ ارم ہے فضا گلستاں کی
سما رہی ہے نظر میں ادا بیاباں کی
ہوا ہُوئی ہے، ہوائے خُنک زمستاں کی
حیات بخش شعاعیں ہیں مہرِ تاباں کی

پگھلتی جاتی ہے اب برف کوہساروں کی
کُچھ اور تیز ہے رفتار جوئباروں کی

ہر ایک سمت ہوائیں مہک اُڑاتی ہیں
بسنتی کھیتیاں سرسوں کی لہلہاتی ہیں
درخت جھومتے ہیں، کلیاں مُسکراتی ہیں
چمن میں بُلبلیں عشرت کے گیت گاتی ہیں

فسوں طراز ہیں جلوے پہاڑ کے، بن کے
جنوں نواز مناظر ہیں صحنِ گلشن کے

مگر ہے نخلِ تمنّا کا اب بھی حال وُہی
وُہی ہے یورشِ برقِ غم و ملال۔ وُہی
مرے خلاف ہے اب تک فلک کی چال وُہی
زباں پہ آتا ہے رہ رہ کے پھر سوال۔ وُہی

الٰہی۔ کیا کوئی اُمیّد بر نہ آئے گی؟
بہار اب کے بھی ایسے ہی بیت جائے گی؟



لالۂ صحرا

مُژدۂ عیش و طرب بادِ صبا لائی ہے ÷ گلشنِ ہند پہ سرمست گھٹا چھائی ہے
مرحبا مُطرب یہ کیا خوب غزل گائی ہے ÷ بزم کی بزم پہ مستی کی ادا چھائی ہے
کوئی طاقت میری غیرت سے جو ٹکرائی ہے ÷ پھر نہ ملنے میں وہ کب؟ کس کو نظر آئی ہے
خاکِ کشمیر سے ہوں گے نہ الگ مر کر بھی ÷ ہم نے یہ عہد کیا ہے۔ یہ قسم کھائی ہے
کوئی ہندو ہو، کہ مُسلم ہو، کہ عیسائی ہو ÷ جو بھی بھارت کا ہے باسی وہ مرا بھائی ہے
خواب میں خُلد کے اب ہوتی ہے کیوں نیند حرام ÷ شیخ جی! حُور تو بھارت میں اُتر آئی ہے
سرِ بکف رہتے ہیں جو امن و اماں کی خاطر ÷ اُن جیالوں سے فقط اپنی شناسائی ہے
عظمتِ ہند کا افسانۂ دل کش ہے وُہ ÷ جس نے ہر غم میں طبیعت میری بہلائی ہے
پانی کشمیر کے چشموں کا بھرے گی کوثر ÷ خود ہی تسنیم ہر اک نہر میں کھنچ آئی ہے

رِشِن کا رنگِ سخن خاک جمے محفل میں
باغِ کشمیر میں وُہ لالۂ صحرائی ہے

